PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۷ شمارہ : ۶

جون ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

ادارایہ	ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے	مشتاق احمد نوری	۳
مطالعۂ شکیل	آں کہ......	ادارہ	۸
	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن: میر شناسی کے آئینے میں	پروفیسر افتخار اجمل شاہین	۱۰
	شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی بوطیقا	شیخ عقیل احمد	۱۷
	تفہیم جمالیات کا ایک درخشاں پہلو: تصوف کی جمالیات	اظہار خضر	۲۴
	مطالعہ جمالیات اور پروفیسر شکیل الرحمٰن	ڈاکٹر مشتاق احمد	۳۰
	باباسائیں، کچھ تاثرات	اسلم بدر	۳۴
	آشرم کے حوالے سے......	کہکشاں تبسم	۳۹
	اختر الایمان: شکیل الرحمٰن کے آئینے میں	پروفیسر شہناز پروین	۴۴
	اقبال کی شاعری کا جمالیاتی مطالعہ اور شکیل الرحمٰن	مسرت جان	۴۶
خراج منظوم	نئے عہد کا منصور	مرتضیٰ اظہر رضوی	۵۱
	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن: نقیب جمالیات	پروفیسر عبدالمنان طرزی	۵۲
	صدائے آشرم / ماہر جمالیات: شکیل الرحمٰن	کہکشاں تبسم / حیدر وارثی	۵۳
تبرکات شکیل	جمالیات	شکیل الرحمٰن	۵۵
	احمد ندیم قاسمی کی تخلیق ''بین''	شکیل الرحمٰن	۵۸
	لمبے قد کا بونا: تجزیاتی مطالعہ	شکیل الرحمٰن	۶۱
ہماری سرگرمیاں	بیگوسرائے میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا شاندار انعقاد		۶۴
	اکادمی اشتراک سے المصور ٹرسٹ کے زیر اہتمام سمینار		۶۵
	اکادمی اشتراک سے دربھنگہ میں شاندار قومی سمینار کا انعقاد		۶۶
سلام و پیام	علیم صبا نویدی، مہدی پرتاپ گڈھی، معین الدین عثمانی، کرشن بھاؤک، شاکر کریمی، طارق علی انصاری، شفیع ایوب، زبیر احمد بھاگلپور، منیر سیفی، شکیل سہسرامی، احتشام احمد قادری، شبانہ عشرت		۶۸

بچوں کا زبان و ادب

۷۳ — ۸۰

PDF Compressor Free Version

اداریہ

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

بابا سائیں ہمیشہ کے لئے اپنے آشرم میں سو گئے، وہ آشرم جس میں ان کی زندگی کے شب و روز گزرے۔ بچپن نے جوانی کی باڑھ لانگھی۔ انہوں نے اپنی زندگی، اپنی معصوم محبت، خاندانی دبدبہ، علمیت کا وقار، جمالیات کی تہداری اور تصوف کا آبشار سب چھوڑ کر آشرم میں پناہ لی۔ انہیں جب ۲۷ اپریل کو اردو اکادمی کا سب سے معتبر سید سلیمان ندوی ایوارڈ دے کر میں واپس ہوا تو مجھے اس بات کا اندازہ لگ چکا تھا کہ یہ ان سے میری آخری ملاقات ہے اور پھر وداعی کے وقت جب انہوں نے سسکتے ہوئے مجھ سے یہ کہا کہ:

''نوری صاحب! آپ مجھے بھولئے گا نہیں۔''

تو میرا گمان یقین میں بدل چکا تھا۔

شکیل الرحمٰن سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۸ء میں ہوئی تھی جب وہ متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر سرفراز کئے گئے تھے۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ خراب حالت متھلا یونیورسٹی کی تھی چاروں طرف مطلق العنانی کا دور دورہ تھا، ایسی حالت میں شکیل الرحمٰن نے ذمہ داری سنبھالی اور جب انہوں نے سدھار کی چھڑی گھمائی تو اس زمانے کے وزیر تعلیم جو غلط طریقے سے پروفیسر کے عہدے پر جا پہونچے تھے، انہیں ڈیموٹ کر کے لکچرر کے عہدے پر لا پٹخا۔

میں اس زمانے میں سمستی پور میں پوسٹیڈ تھا۔ اپنے عزیز دوست نعیم فاروقی کے ساتھ ان سے ملنے آیا جو ''ہندوستان'' اخبار سے وابستہ تھے اور ان کا انٹرویو لینے کی غرض سے دربھنگہ آئے تھے۔ شکیل الرحمٰن کا قد و قامت، ان کی گفتگو، ان کی بردباری، ان کی سوچ و فکر میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اور چمکتی ہوئی چوڑی پیشانی نے مجھے کافی متاثر کیا۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے متھلا یونیورسٹی کی ایسی نکیل کسی کہ سدھار کے ساتھ دشمنی کے تیور بھی تیز سے تیز تر ہونے لگے۔ وزیر تعلیم کے علاوہ یونیورسٹی کے بہت سارے اساتذہ اور آفیسران ان کی زد میں آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں وائس چانسلر کے عہدے سے وقت سے پہلے ہٹنا پڑا، لیکن جب وہی وزیر تعلیم وہاں سے ایم۔ پی کے لئے کھڑے ہوئے تو شکیل الرحمٰن نے بھی ان کی مخالفت میں اپنا پرچم بلند کیا اور یونیورسٹی کے تمام طالب علم ان کے حق میں پرچار کرنے کے لئے میدان میں اتر آئے۔ شکیل الرحمٰن کی مقبولیت نے اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ سیاست میں ایک نو وارد بھی اگر باکردار ہو تو وہ بے کردار تجربہ کار سیاست کے ماہر کھلاڑی کو بھی ہرا سکتا ہے اور جب چندر شیکھر سنگھ وزیر اعظم بنے تو انہوں نے شکیل الرحمٰن کو وزیر صحت کے عہدے پر فائز کیا اور وہاں بھی انہوں نے اپنی صلاحیت کا سکہ جمایا۔

وزارت کے ختم ہونے کے بعد شکیل الرحمٰن گوشہ نشیں ہو گئے اور انہوں نے دلی سے دور گوڑگاؤں میں اپنی ایک کٹیا بنالی جسے انہوں نے ''مدھوبن'' کا نام دیا اور باقی زندگی ایک صوفی کی طرح ادب کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔ شکیل الرحمٰن نے تنقید کی ایک نئی

PDF Compressor Free Version

صنف دریافت کی جسے انہوں نے ''جمالیات'' کا نام دیا۔ انہوں نے جمالیات پر جتنی کتابیں لکھی ہیں اتنی کسی اور نے آج تک نہیں لکھی۔

شکیل الرحمٰن کی کتابیں کلاسیکی ادب کے زمرے میں آتی ہیں۔ انہوں نے مولانا رومی کی جمالیات، غالبؔ کی جمالیات، امیر خسروؔ کی جمالیات، محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، نظیرؔ اکبر آبادی کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، مرزا غالبؔ اور ہند مغل جمالیات، ہندوستان کا نظام جمال، بودھ جمالیات سے جمالیات غالبؔ تک وغیرہ کے علاوہ میرؔ شناسی، منٹو شناسی، فکشن کے فنکار: پریم چند، احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان: جمالیاتی لیجنڈ کے علاوہ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا پر بھی لکھا۔

شکیل الرحمٰن پٹنہ یونیورسٹی کے پہلے ریسرچ اسکالر ہیں، جن کی پی۔ ایچ ڈی کی تھیسس پر ممتحن نے ڈی لٹ کی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح وہ پٹنہ یونیورسٹی کے پہلے ڈی لٹ یافتہ ہیں۔ ان کی وہ تھیسس پریم چند پر تھی جو ''فکشن کے فنکار: پریم چند'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

''آشرم'' ان کی خودنوشت ہے۔ ''آشرم'' پڑھنے کے بعد میں نے ان سے فرمائش کی کہ ''آشرم'' تو شروع کے زمانے کی داستان ہے، لیکن کشمیر یونیورسٹی اور مظفر پور یونیورسٹی کے وی سی بننے کے بعد جب وہ متھلا یونیورسٹی کے وی سی بنے تو سب سے ہنگامہ خیز دور دربھنگہ ہی کا تھا، اس لئے انہیں دربھنگہ کے حالات پر بھی ایک خودنوشت لکھنی چاہئے۔ میرے کئی بار ضد کرنے پر انہوں نے ''دربھنگے کا جوذکر کیا'' کے نام سے اپنی سوانح لکھی اور اس کتاب کو انہوں نے میرے نام معنون کر دیا۔ یہ ان کی محبت تھی، ان کا بڑا پن تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری ان سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ میری کچھ تحریروں سے کافی متاثر تھے، اس لئے اپنی محبت سے نوازتے رہے اور اپنی تمام کتابیں مجھے بھیجتے رہے۔

میں پہلی بار جب گوڑگاؤں ان سے ملنے گیا تو وہ کافی خوش ہوئے اور کئی گھنٹے تک میں ان کے ساتھ رہا۔ ان دنوں ان کی چھوٹی بیٹی شاہینہ روس سے آئی ہوئی تھیں، لنچ میں کافی اہتمام کیا گیا کہ میں اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا کہ بابا سائیں جیسے ادیب کے ساتھ مجھے لنچ کرنے کا موقع ملا۔ دربھنگہ میں مجھ سے پہلی ملاقات وہ بھول چکے تھے، اس لئے گوڑگاؤں میں ہوئی ملاقات ان کے لئے پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کئی ملاقاتیں رہیں اور فون سے برابر رابطہ ہوتا رہا، حال کے برسوں میں وہ کافی بیمار رہنے لگے تھے۔ پڑھنا جاری تھا، لیکن لکھنا بہت کم ہو گیا تھا۔ دوسری ملاقات میں بھی شاہینہ شکیل موجود تھیں۔ وہ بہت ہی اچھی آرٹسٹ ہیں خصوصاً لکڑی پر وہ بہت عمدہ نقش و نگار ابھارتی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے انگریزی میں کئی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں کچھ کانونٹ اسکول کے کورس میں بھی شامل ہیں۔

بابا سائیں ایک گوشہ نشیں ادیب تھے، کسی بھی گروپ سے ان کی وابستگی نہیں تھی۔ وہ کسی بھی بڑے سے بڑے ایوارڈ کے مستحق تھے، لیکن کسی کی بھی خصیہ برداری کرنے سے معذور تھے، جب کہ آج کل انعام واکرام کے لئے یہ صفت لازمی ٹھہرتی ہے، وہ علم وادب کے درویش تھے اور انہیں اس کی ذرہ برابر فکر بھی نہیں تھی۔ ادب کا کوئی ایسا سائیں میری نظر سے نہیں گزرا جو اپنے معاملے میں اتنا قانع رہا ہو۔ انہوں نے کئی ممالک کا دورہ کیا۔ ہر جگہ ادیبوں سے ان کی ملاقات رہی، لیکن انہوں نے اپنی شخصیت پر کسی کی چھاپ نہیں پڑنے دی، کیونکہ بہت سے معاملے میں وہ کافی اصول پسند تھے اور چاپلوسی کی ہنر سے یکسر محروم تھے۔

PDF Compressor Free Version

آخری دنوں میں وہ کافی بیمار رہنے لگے تھے، لیکن ''زبان وادب'' پابندی سے پڑھتے تھے، کبھی کبھی خط بھی لکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مجھے فون کیا کہ:

''تمہارے لئے ایک مضمون لکھ رکھا ہے، تم آؤ تو لے لینا۔''

انہوں نے اپنی آخری ملاقات میں، وہ مضمون میرے حوالے کیا جو اس شمارے میں شامل ہے۔

بابا سائیں نے اپنی زندگی لگ بھگ تنہا ہی گزاری، البتہ ان کی شریک حیات ہر لحہ ان کے ساتھ رہیں، لیکن ایک بار اپنے مکان ''مدھوبن'' میں جب وہ بیہوش ہو کر گر پڑے تو ان کی بیٹی انجم شکیل انہیں اٹھا کر اپنے گوڑگاؤں کے ہی فلیٹ میں لے آئیں تا کہ ان کی بہتر دیکھ بھال ہو سکے اور آخری دم تک وہ اسی فلیٹ میں رہے۔

اکادمی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ستمبر ۲۰۱۵ء کے آخری دنوں میں جب میں ان سے ملا تو وہ بہت زیادہ علیل لگے۔ ان کی اس تشویشناک حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے، ۷ رنومبر ۲۰۱۵ء کی اکادمی مجلس عاملہ کی نشست میں انہیں اکادمی کا سب سے بڑا ایوارڈ دینے کی سفارش کی کہ بقیہ ایوارڈ بعد میں طے کر لئے جائیں گے۔ یہ سفارش قبول ہوئی، لیکن جب میں نے انہیں مجلس عاملہ کے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ خوش تو ہوئے، لیکن تنہا ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ انہیں غالباً یہ محسوس ہوا کہ شاید ان کی بیماری پر ترس کھا کر اکادمی انہیں الگ سے ایوارڈ دے رہی ہے، جسے ان کی خودداری نے گوارا نہیں کیا اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب سارے ایوارڈس دئے جائیں تو اسی وقت مجھے بھی دیا جائے، میں الگ سے ایوارڈ لینا نہیں چاہوں گا۔ ان کی اس بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی غیرت وحمیت سے کسی بھی حال میں سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔

فروری میں سارے ایوارڈس کے فیصلے ہوئے، سارے ایوارڈیافتگان کے اکاؤنٹ میں ایوارڈ کی رقم جمع کرادی گئی، البتہ مومنٹو اور سند کی تقسیم گاہے بگاہے ہونے والے اکادمی کے پروگرام میں وزیر محترم ڈاکٹر عبدالغفور کے ذریعہ عمل میں آئی، لیکن شکیل الرحمٰن اور جوگیندر پال چونکہ کافی بیمار تھے، اس لئے ان کا مومنٹو اور سند ان تک مجھے ہی پہونچانا تھا اور اس کے لئے ۲۷ راپریل کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھے، لیکن جوگیندر پال مجھ سے ملے بغیر اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور شکیل الرحمٰن نے یہ دونوں چیزیں حاصل کر کے اکادمی کے وقار میں اضافہ کیا۔

۹ رمئی ۲۰۱۶ء کو جب میں ''اکادمی آپ تک'' کے پروگرام کو انجام دینے کے لئے بیگوسرائے کے سفر پر تھا تو راستے میں ہی ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مجھے ان کی رحلت کی جانکاہ خبر سنائی اور مجھے لگا کہ اردو ادب ایک ایسے جمالیاتی لیجنڈ سے محروم ہو گیا ہے جس کی بھرپائی اب کسی قیمت پر نہیں ہو سکتی۔

۱۱ رمئی کو دوپہر سے قبل ادھ چینی کی مسجد میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور وہیں کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ جنازے میں لوگوں کی تعداد نے اس بات کا احساس کرایا کہ ہمارے اندر سے بزرگوں کا احترام ختم ہو گیا ہے، بے حسی غالب آ گئی ہے اور ہم شاید یہ بھول گئے ہیں کہ ایک دن ہمیں بھی سپرد خاک ہونا ہے۔

PDF Compressor Free Version

شکیل الرحمٰن پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کی کتابوں پر لکھے گئے مضامین کے بھی کئی مجموعے شائع ہو گئے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا کیونکہ بابا سائیں ایسے نہیں تھے جنہیں بہت آسانی سے بھلایا جا سکے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دے اور اپنی رضا بھی نصیب کرے۔ آمین

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی موضوع کے لئے پورا شمارہ وقف کرنے کا ارادہ کیا، اعلان بھی کیا جاتا ہے، مگر موصولہ مواد کی کیفیت اور کمیت سے مایوسی ہاتھ آتی ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات کاوشیں محض ایک گوشے میں سمٹ جاتی ہیں، لیکن میں اسے ادب کے سائیں کی خاموش کرامت ہی کہوں گا کہ میں نے تبرکاً چند اوراق بروقت سائیں بابا کی یاد میں وقف کرنے کا خیال کیا تھا اور چند لوگوں سے اس سلسلے میں اظہار خیال کے لئے فون کیا، مگر کسی دشواری، کسی یاددہانی کے بغیر یکے بعد دیگرے بہت ساری نگارشات آ گئیں۔ اب یہ نگارشات ''مطالعہ شکیل'' اور ''منظوم خراج عقیدت'' کے تحت شریک اشاعت ہو رہی ہیں۔ ساتھ ہی ''تبرکات شکیل'' بھی ہے اور اس طرح یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ شکیل الرحمٰن، علمی مقبولیت کے کس اعلیٰ دارفع مقام پر فائز تھے۔ بیشک مخلصانہ محنت و محبت کرنے والوں کا انعام ان کی زندگی میں بھی انہیں ملتا ہے اور اس دارفانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی اس کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

یہ شمارہ جب آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، اس وقت تک رمضان المبارک کا مقدس مہینہ سایہ فگن ہو چکا ہوگا۔ ہم اس مقدس مہینے کی مبارکباد آپ سبھوں کی نذر کرتے ہیں، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ اس کی زیادہ سے زیادہ برکتیں سمیٹنے کی ہمیں سچی توفیق عطا فرمائے۔

PDF Compressor Free Version

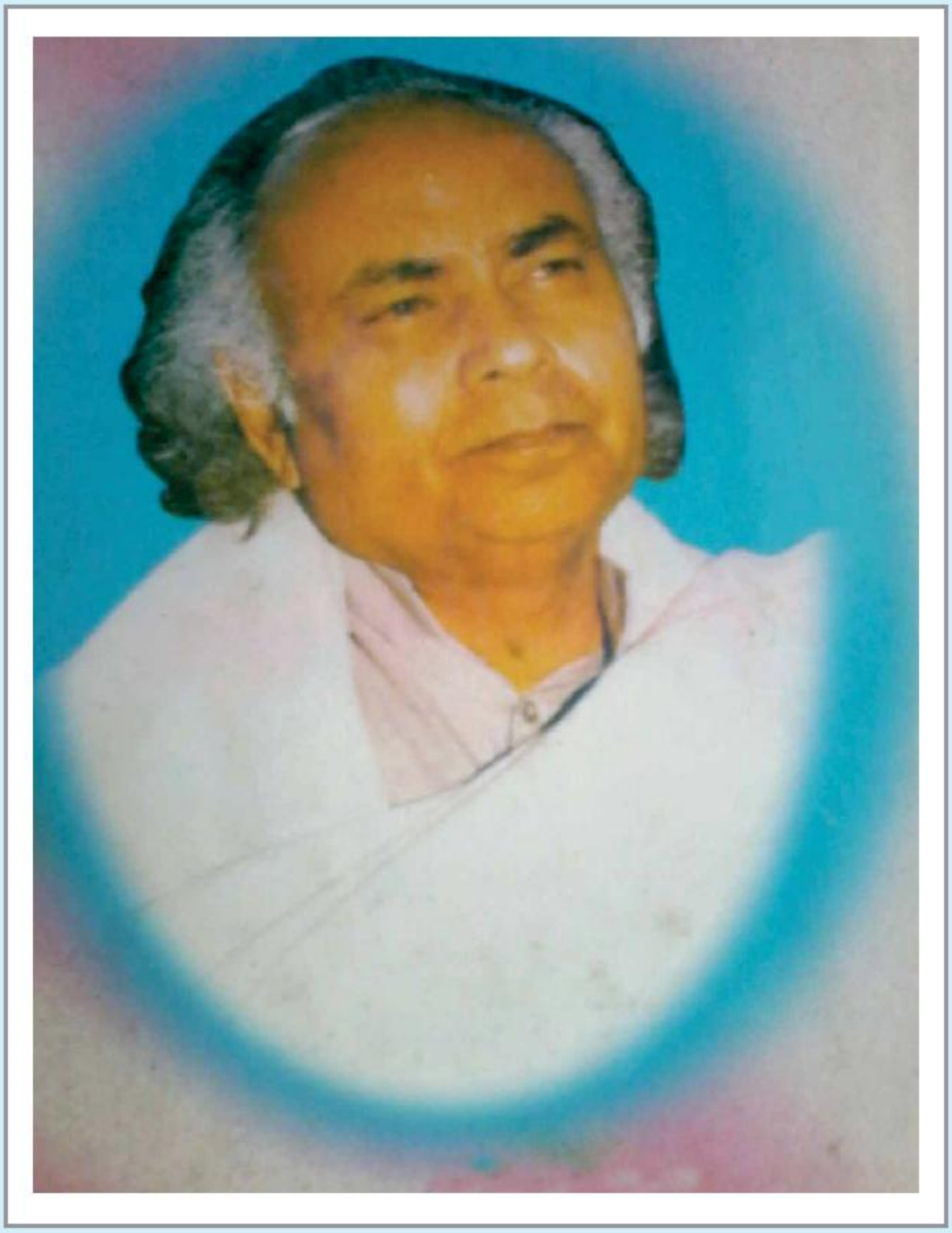

آہ! پروفیسر شکیل الرحمٰن: ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

PDF Compressor Free Version

مطالعۂ شکیل

آں کہ.....

(کوائف و کارگزاریاں)

نام : محمد شکیل الرحمٰن

والد : خان بہادر مولوی محمد جان

والدہ : امت الافاطمہ

تاریخ پیدائش : ۱۸؍فروری ۱۹۳۱ء

مقام پیدائش : موتیہاری، چمپارن (بہار)

علمی لیاقت : بی۔اے آنرز، فرسٹ کلاس فرسٹ، پٹنہ یونیورسٹی

ایم۔اے فرسٹ کلاس، پٹنہ یونیورسٹی (طلائی تمغہ)

ڈی۔لٹ، پٹنہ یونیورسٹی

مناصب : پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ☆ ڈین فیکلٹی، کشمیر یونیورسٹی

ڈین فیکلٹی آف اورینٹل اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی

چیئرمین ڈائرکٹر، سنٹر آف سنٹرل ایشین اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی

وائس چانسلر، بہار یونیورسٹی ☆ وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی

وائس چانسلر، ایل۔این۔متھلا یونیورسٹی، بہار

ممبر، لوک سبھا در بھنگہ (بہار) سے

مرکزی وزیر برائے صحت و خاندانی فلاح، حکومت ہند

چیئرمین، سائنس اور ٹیکنالوجی، پارلیمنٹ آف انڈیا

ممبر، پریولیج کمیٹی، پارلیمنٹ آف انڈیا

ممبر، مرکزی حج کمیٹی

PDF Compressor Free Version

تصانیف : ☆ اساطیر کی جمالیات ☆ مولانا رومی کی جمالیات ☆ جمالیات حافظ شیرازی ☆امیر خسرو کی جمالیات☆ کبیر☆ نظیر اکبرآبادی کی جمالیات☆ میر شناسی ☆ تصوف کی جمالیات☆ کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات☆ محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات☆ داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا☆ فکشن کے فنکار: پریم چند☆ منٹوشناسی ☆احمد ندیم قاسمی: ایک لیجنڈ ☆ مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات☆ رقص بتانِ آذری☆ غالب کا داستانی مزاج☆ غالب اور مغل مصوری☆ غالب کی جمالیات ☆ آشرم (خودنوشت سوانح حیات) ☆ ہندوستان کا نظام جمال: بدھ جمالیات سے جمالیاتِ غالب تک (تین جلد) ☆ ہندوستانی جمالیات (تین جلد) ☆ قرآن حکیم: جمالیات کا سرچشمہ☆ راگ راگنیوں کی تصویریں☆ محمد اقبال☆ فراق کی جمالیات ☆اختر الایمان: جمالیاتی لیجنڈ ☆ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا☆ محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات☆ جپ جی صاحب (مع مقدمہ ومفاہیم) ☆ دربھنگہ کا جوڈکر کیا

وفات : ۸رمئی ۲۰۱۶ء ۱۱ بجے رات بمقام گوڑگاؤں، تدفین ۱۱ مئی ۲۰۱۶ء ادھ چینی قبرستان، دہلی

شکیل الرحمن کے کارناموں کا اعتراف ، تجزیہ و تعبیر

☆ شکیل الرحمٰن: ایک لیجنڈ : ترتیب وتہذیب: شعیب شمس

☆ شکیل الرحمٰن: تخلیقی تنقید کا ایک منفرد دبستان : اقبال انصاری

☆ شکیل الرحمٰن: اردو تنقید کا نیا وژن : مرتبہ: محمد صدیق نقوی

☆ شکیل الرحمٰن کی غالب شناسی : ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی

☆ شکیل الرحمٰن اور مولانا رومی کی جمالیات : مرتبہ: محمد صدیق نقوی

☆ منٹوشناسی اور شکیل الرحمٰن : مرتبہ: ڈاکٹر کوثر مظہری

☆ فکشن کے فنکار پریم چند اور شکیل الرحمٰن : مرتبہ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

☆ آہنگ جمالیات کے ناقد: شکیل الرحمٰن : اظہار خضر

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

Karachi, Pakistan

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن: میرؔ شناسی کے آئینے میں

اردو کے تین ممتاز اور مقتدر شعرا پر خاص طور پر زیادہ لکھا گیا ہے، ان شعرا میں بالترتیب میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غالبؔ اور اقبالؔ کے مقابلے میں میرؔ پر کم لکھا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ میرؔ کا کلام ان دونوں شعرا کے مقابلے میں سہل ہے، مگر میرؔ کی شاعرانہ عظمت اپنی جگہ مسلم ہے جن کا شمار اردو کے چند منفرد، اہم اور ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ایک بار چند سال پیشتر علامہ اقبالؔ کے سلسلے میں منعقدہ سیمینار میں شرکت کے لئے لیڈی مٹکاف امریکہ سے تشریف لائی تھیں۔ ٹی وی پر ایک انٹرویو میں جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ غالبؔ اور میرؔ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتی ہیں تو انہوں نے میرؔ کا نام لیا تھا اور اس کی توجیہ بھی اس طرح کی تھی کہ میرؔ غالبؔ کے مقابلے آسان فہم شاعر ہیں، ان کا کلام جلد اور آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کہ میرؔ بھی ان معدودے چند شعرا میں ہیں جو مشہور ہی نہیں بلکہ لوگوں میں مقبول بھی ہیں۔ مذکورہ بالا شعرا سے متعلق جو کچھ بھی لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے ان کو باقاعدہ ''میریات''، ''غالبیات'' اور ''اقبالیات'' کا نام دیا گیا ہے یعنی ان سے متعلق لکھی گئی تحریریں اب ایک مکمل شعبہ کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔

میرؔ شناسی سے متعلق پہلی اہم کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ہے۔ انہوں نے انتخاب کلام میرؔ کے نام سے ایک بڑا عمدہ انتخاب پیش کیا تھا اور اس پر ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا تھا جس میں میرؔ کی جملہ خصوصیات کا بطور احسن جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ تقریباً ساٹھ سال پہلے (اب سے اسی سال سمجھ لیا جائے کیونکہ جالبی صاحب کی کتاب محمد تقی میر، ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی) بابائے اردو نے ۱۹۲۱ء میں اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ انتخاب میر کے نام سے ''کلیات میرؔ'' کا انتخاب شائع کیا جو اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ ''انتخاب میرؔ'' بر عظیم کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔

میرؔ کے سلسلے میں بابائے اردو نے اور بھی دو اہم اور گراں قدر کام کئے ہیں، یعنی ''نکات الشعرا'' شائع کیا، پھر ''ذکر میر'' تلاش کر کے ۱۹۲۸ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا اور بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ان دو تصانیف کی اشاعت نے میرؔ کی شاعری کے مطالعے کا نہ صرف رخ بدل دیا بلکہ ادب کے مورخوں کو اردو ادب کی تاریخ نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

میرؔ شناسی کے سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا کام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب ''میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری'' دراصل ان کے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ میرؔ کے سلسلے میں یہ ایک اہم مقالہ ہے جو میرؔ شناسی میں ہمیں مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ولی کالج کے میگزین کا ''میرؔ نمبر'' بھی اس سلسلے کی ایک قابل ذکر کڑی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''نقد میرؔ'' بھی ''میریات'' میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ نقوش کے ''میرؔ نمبر'' کی بھی اس سلسلے میں اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، ورنہ مجھے تو اس کتاب پر کچھ کہنا ہے جس میں شکیل الرحمٰن نے میرؔ اور ان کی شاعری سے متعلق اپنے خیالات اور اپنی آرا کا اظہار ایک نئے انداز سے اور بڑی عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کتاب پر جابر حسین نے مختصر مگر جامع مقدمہ لکھا ہے اور میرؔ سے متعلق چند اہم اور سچی باتیں نہایت اختصار کے ساتھ کہہ دی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

PDF Compressor Free Version

''میرؔ کی شاعری مجھے خاموش لمحوں کی حکایت محسوس ہوتی ہے۔ مکالمے کی زبان میں وہ ہمارے وجود کو داخلی سطحوں پر سرگوشیاں کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''

اس کے بعد میرؔ کے چند اہم متعلقہ اشعار مثال کے طور پر پیش کئے ہیں اور پھر شکیل الرحمٰن سے متعلق کہا ہے:

''شکیل الرحمٰن کی تنقید میں حکایت گوئی کا لطف ملتا ہے۔ شائستہ مکالموں کی دھنیں اور مہذب سرگوشیوں کی ترنگیں ملتی ہیں۔''

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ان کی تنقید پڑھنے والوں کی تعداد میں ادھر خاصا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے ان کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ادھر یعنی گزشتہ چند برسوں میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی تنقید اور بالخصوص ان کی جمالیات تنقید کی طرف لوگوں نے توجہ دی ہے۔

مجھے اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یا اس کی اہم خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ شکیل الرحمٰن نے اس کتاب میں میرؔ کا ایک خاص زاویے سے جائزہ لیا ہے۔ یعنی شرینگار رس کے حوالے سے میرؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اپنی اس کتاب ''میرؔ شناسی'' میں میر تقی میرؔ کی جمالیات پر گفتگو کی ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ جمالیات شکیل الرحمٰن کا مخصوص شعبہ ہے۔ انہوں نے جمالیاتی نقطہ نظر سے اردو کے مختلف شعرا و ادبا کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے، اس حوالے سے ان کی مندرجہ ذیل کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) مرزا غالبؔ: اور ہند مغل جمالیات (۲) اقبالؔ: روشنی کی جمالیات (۳) ہندوستانی جمالیات (تین حصوں میں) (۴) امیر خسروؔ: کی جمالیات (۵) فیض احمد فیضؔ: الیہ کی جمالیات (۶) کبیر (کبیر داس) (۷) قرآن حکیم: جمالیات کا سرچشمہ (۸) مولانا رومی کی جمالیات (۹) تصوف کی جمالیات (۱۰) محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات (۱۱) جمالیات حافظؔ شیرازی (۱۲) ہند اسلامی جمالیات (۱۳) ہندوستان کا نظام جمال: بدھ جمالیات سے جمالیات غالبؔ تک (تین حصوں میں)

ان کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں میں بھی جمالیاتی تصورات ہیں یعنی ان کی اساس جمالیاتی فکر و فن پر ہے، مثلاً ''محمد اقبال''، ''منٹو شناسی''، ''اختر الایمان''، ''جمالیاتی لیجنڈ''، ''لندن کی آخری رات'' وغیرہ۔ ''میر شناسی'' بھی جمالیاتی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اس کتاب کے آغاز میں ہندوستانی جمالیات ''شرینگار رس'' کا ذکر کرتے ہیں اور اسی نقطہ نظر سے میرؔ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اس جمالیاتی فلسفے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستانی جمالیات میں 'شرینگار رس' تمام رسوں کا سرچشمہ تصور کیا گیا ہے۔ یہ رس محبت اور غم کے جذبوں سے پیدا ہوتا ہے۔''

اس کے بعد اس فلسفے کا میرؔ کی شاعری پر اطلاق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرؔ شرینگار رس کے ایک ممتاز شاعر ہیں، عشق کی کار فرمائی میرؔ کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ عشق میرؔ کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے۔ عشق ہی محبت کے جذبے کا جمالیاتی تجربہ ہے۔ عشق ہی شرینگار کا مرکز ہے، اسی کے تحریک سے یہ رس اُبلتا ہے، اپنی شیرینی اور مٹھاس عطا کرتا ہے، غمنا کی لئے ہوئے یہ رس قاری کے جذبے کو صرف متاثر ہی نہیں کرتا بلکہ قاری کے باطن میں 'کتھارسس' کی کیفیت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ شعور، احساس، تخیل سب متاثر ہوتے ہیں۔''

شرینگار رس کی مزید تعریف کرتے ہوئے شکیل الرحمٰن کہتے ہیں:

''اس اصطلاح کے متعلق ایک خیال یہ ہے کہ اس کا تعلق شر (SR) سے ہے جس کے لغوی معنی ہیں 'مارنا'، 'مار دینا' (Srhim Sabam) کا مفہوم ہے اس شخصیت کا خاتمہ کہ جسے عشق کا تجربہ حاصل ہوا، وہ ختم ہو گیا، عشق ختم کر دیتا ہے، مار ڈالتا ہے۔''

اس سلسلے میں ولیؔ کا یہ شعر بھی نقل کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

جسے عشق کا زخم کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

مگر اس عشق اور اس عشق کے جذبے کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے

PDF Compressor Free Version

بھی برتا ہے، مثلاً مولانا روم کہتے ہیں۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اور علامہ اقبال نے تو عشق کا مفہوم ہی بدل ڈالا، مگر میر کے حوالے سے جو باتیں شکیل الرحمٰن نے کہی ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ الگ ہے، اسی لئے شرینگاررس کے حوالے سے جو بات کہی ہے اس میں وزن ہے اور اس طرح انہوں نے میر کی شاعری کا جائزہ ایک نئے انداز سے لیا ہے، مگر شرینگاررس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک مفہوم جنس یا سیکس کے اثر کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''معروف عالم جمالیات 'ابھی نوگپت' کہتے ہیں کہ لفظ شرینگاررس دراصل 'سرنگ' (Srnga) سے نکلا ہے جس کا مفہوم ہے 'جس کا گہرا اثر سیکس کی جبلت پر ہو۔ وہ تجربہ جو عشق سے حاصل ہو اور 'سیکس' کی جبلت کو متاثر کرے وہی شرینگاررس ہے۔''

ان دونوں مفاہیم سے متعلق شکیل الرحمٰن کا کہنا ہے کہ اس میں تضاد نہیں ہے اور یہ دونوں مفاہیم شرینگار کی اصطلاح کی معنویت میں کشادگی پیدا کرتے ہیں، مگر میری ناقص رائے میں ان دونوں کے مفاہیم میں تضاد موجود ہے اور خاص طور پر میر کی شاعری کے حوالے سے دوسرا مفہوم درست نہیں ہے، کیونکہ میر کی شاعری میں جنس (sex) کا اثر یا اس کا اظہار اس طرح نہیں ہوا ہے جیسا کہ بعض شعرا یا ادبا کے یہاں موجود ہے۔ چند اشعار ایسے ضرور مل جائیں گے، مگر بحیثیت مجموعی میر کے یہاں جنس کا اثر یا اس کا غلبہ موجود نہیں ہے۔ ویسے چند اشعار تو غالب، ذوق اور داغ کے یہاں بھی مل جائیں گے۔ ہاں شرینگار کے پہلے مفہوم کا اطلاق میر کی شاعری پر ہوتا ہے اور بھرپور انداز میں ہوتا ہے، اس طرح شکیل الرحمٰن کا اس نقطہ نظر سے میر کی شاعری کا مطالعہ بہت اہم ہے۔

شکیل الرحمٰن کہتے ہیں کہ میر کی شاعری عشق کے جذبے کی ایک ایسی شاعری ہے کہ جسے تھپک کر دیکھتے رہنے کی خواہش ہوتی رہتی ہے۔ میر کا تجربہ بھی یہی ہے کہ ''عشق ختم کر دیتا ہے جو محبت میں گرفتار ہوا وہ گیا'' یہ کہہ کر مصنف نے میر کے چند اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں۔

پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر ہو گئے
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

رفتہ عشق کیا ہوں میں اب کا
جا چکا ہوں جہاں سے میں کب کا

گو بے کسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا
میں جوں چراغ گور اکیلا جلا کیا

قتل کیے پر غصہ کیا لاش مری اٹھوانے دو
جان سے ہم بھی جاتے ہیں، تم بھی آؤ جانے دو

اس کے بعد میر کے وہ اشعار رقم کئے ہیں جو شرینگاررس کے دوسرے مفہوم کے تحت آتے ہیں اور اسی سلسلے میں تقریباً ۳۴، اشعار نقل کر دئے ہیں، گو اس سے کم اشعار میں بھی ان کا مطلب نکل سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اپنے موقف کی وضاحت میں پندرہ سے زیادہ اشعار قلم بند کئے ہیں، مگر دوسرے مفہوم کے سلسلے میں جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں سے بیشتر اشعار پہلے مفہوم کے ذیل میں آتے ہیں۔ میر کے یہاں بہت کم اشعار ایسے ہیں جن کو شرینگاررس کے دوسرے مفہوم کے تحت پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں ان کی اس بات سے تو ضرور اتفاق کرتا ہوں:

''عورت اور مرد کی محبت کی شدت اور ان کی جذباتی کیفیتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ سب جو جمالیاتی تجربے حاصل کرتے ہیں انہیں محسوس بھی کرتے ہیں، مگر ان کا فن کارانہ اظہار تو نہیں کر سکتے، تخلیقی فن کار ہی ان جمالیاتی تجربوں کو ایسے ڈرامائی اور تمثیلی انداز میں پیش کرتا ہے کہ ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے..... فن کار کی ذہن کی شادابی انہیں زندگی بخش دیتی ہے۔ شرینگاررس لئے ہوئے ایسے تمام تجربوں میں میر کے تخیل کی شادابی متاثر کرتی ہے۔''

اس حقیقت کا میر کی عشقیہ شاعری پر اطلاق ہوتا ہے، مگر میر کے یہاں جنس کا اظہار اس طرح ہرگز نہیں ہوا جیسا کہ شرینگاررس کے دوسرے مفہوم کا تقاضا ہے۔ بہر حال شکیل الرحمٰن نے شرینگاررس کے پہلے مفہوم

PDF Compressor Free Version

کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں وزن ہے اور اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، اس حوالے سے ان کا میرؔ کا مطالعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان کی جمالیات کا یہ حوالہ ان کے وسیع مطالعے اور جمالیات سے متعلق ان کی دلچسپی کا واضح اور بین ثبوت ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی میرؔ کو دنیا کے عظیم غنائی شاعروں میں شمار کرتے ہیں، وہ میرؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میر کا اصل میدان غزل ہے۔ یہ وہ صنف سخن ہے جہاں ان کے جوہر کھلتے ہیں ..... غزل داخلی اور غنائی صنف سخن ہے اور عشق اس کا خاص موضوع ہے۔''

اردو غزل سے متعلق حالی نے بھی یہی کہا تھا کہ غزل دراصل عشق کا اظہار ہی ہے اور یہی اس کی اصل خوبصورتی ہے۔ تقریباً تمام شعرائے غزل کے اندر عشق کے مضامین کا اظہار ہوا ہے اور یہ ضروری ہے کہ غزل کی بنیاد عشق و محبت کے مضامین پر ہی رکھی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو غزل کی خوبصورتی باقی نہیں رہے گی، بالکل ایسا ہوگا کہ گلاب کی رنگت تو باقی رہے، لیکن اس میں خوشبو نہ ہو۔ میں نے حالی کی یہ رائے ان کے الفاظ میں بیان نہیں کی ہے بلکہ ان کا مفہوم بڑی حد تک انہیں کے انداز میں بیان کر دیا ہے ان کی اس رائے سے اب اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اب ایسی غزلیں لکھی جا رہی ہیں جن میں روایتی عشق موجود نہیں ہے بلکہ اب تو غزل میں ہر طرح کے مضامین پیش کئے جا رہے ہیں، مگر جہاں تک میرؔ کی شاعری کا تعلق ہے وہ انہیں معنوں اور مفہوم میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ عشق غزل کا بنیادی اور اساسی موضوع رہا ہے۔ غزل کی پہلے تعریف بھی اس طرح کی جاتی تھی۔ ''حرف زدن با زناں'' یعنی جس میں عورتوں کے متعلق بات کی جائے، پھر اس کی تعریف میں تبدیلی آئی اور رفتہ رفتہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی کیونکہ اب تو ہر طرح کے موضوعات غزل کے پیرائے میں پیش کئے جا رہے ہیں، مگر عشق اور معاملات حسن و عشق کو آج بھی غزل کے شعرا اپنے اپنے طور پر برت رہے ہیں۔

میرؔ کی شاعری میں عشق کا اظہار جا بجا ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: ''میرؔ کی شاعری کا محور بھی عشق ہے''۔

خالی نہیں بغل کوئی دیوان سے مرے
افسانہ عشق کا ہے یہ مشہور کیوں نہ ہو

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

عشق معشوق ، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

اور اس عشق کے سلسلے میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کہتے ہیں:

''دل عشق کا مرکز اور سرچشمہ ہے۔ محض ایک قطرۂ خون ہے، لیکن سرچشمہ توانائی ہے۔ دل کا ذکر کر کے میرؔ نے عشق اور اس کی توانائی کا احساس بالیدہ کیا ہے''۔

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن مزید کہتے ہیں:

''انسان کے وجود اور اس کے باطن کی توانائی کا احساس میرؔ کے احساس حسن کا ایک اہم پہلو ہے..... چونکہ انسان کا دل حسن و عشق کا مرکز ہے، اس لئے انسان سب سے زیادہ قیمتی ہے۔''

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی تنقید چونکہ جمالیاتی تنقید ہوتی ہے، اس لئے وہ میرؔ کے حوالے سے ان کی شاعری میں جمالیات ہی کی جلوہ گری محسوس کرتے ہیں اس سلسلے میں ان کا یہ کہنا درست ہے:

فن کار کی سائیکی کو جو روحانی جمالیاتی انبساط اور درد کی روحانی اور جمالیاتی لذت حاصل ہوتی ہے انہوں نے اسے بڑی سادگی سے قاری کی سائیکی کو عطا کر دیا ہے۔''

اس سلسلے میں مجھے ان کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دئے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کہتے ہیں کہ میرؔ کے عاشق کا جمالیاتی شعور بالیدہ ہے یہی وجہ ہے کہ حسن کا احساس مجسم ہو جاتا ہے، مگر اس کے بعد میرؔ کے جو

PDF Compressor Free Version

دو اشعار نقل کیے ہیں ان میں سے ایک شعر کا مفہوم ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں وہ سمجھتے ہیں، وہ شعر ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ آفاق کی شیشہ گری کہہ کر (میر نے) زندگی کے حسن و جمال کو جس طرح سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہ بہت بڑی بات ہے۔ ناز، شفاف اور رنگ برنگے شیشوں کی یہ دنیا انتہائی خوبصورت اور حسین ہے۔ یہاں زور سے سانس لئے جائیں تو شیشے ''چٹک جائیں گے'' مگر میر کے اس شعر میں شیشے سے مراد ''شیشہ دل'' ہے۔ میر نے دنیا کو شیشے کے کارخانے سے تشبیہ دی ہے۔ مشابہت کی وجہ دونوں معاملات کی نزاکت ہے۔ شیشے کے کارخانے میں، ذرا سی غفلت برتی جائے تو کوئی نہ کوئی شیشہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح دنیا میں ذرا سی لاپروائی سے کسی نہ کسی کے دل کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ یہاں کے معاملات اتنے نازک ہیں کہ ذرا سی غفلت سے کسی کی دل شکنی ہو سکتی ہے۔ میر انیس نے بھی اسی بات کو اس انداز سے کہا ہے۔

خیالِ خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بہر حال شکیل الرحمٰن نے جو دوسرا شعر اس سلسلے میں نقل کیا ہے وہ درست اور مناسب ہے۔

کیا صورت ہے کیا قامت ہے دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منہ دیکھو جو کوئی کلال بنا دے گا

عاشق کے حوالے سے شکیل الرحمٰن نے جو حسن پسندی کے اشعار پیش کیے ہیں ان شعروں میں محبوب کا سراپا جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔

کیا چہرہ تجھ سا ہوتا اے آفتابِ طلعت
منہ چاند کا جو ہم نے دیکھا تو چھائیاں ہیں

(چہرہ)

میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی
جینا دوبھر ہوا مسیحا کا

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

(لب، ہونٹ)

گزرا میں اس سلوک سے دیکھا نہ کر مجھے
برچھی سی لاگ جا ہے جگر میں تری نگاہ

(نگاہ)

اس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے
شمع سے جیسے لیں چراغ لگا

(بدن کا رنگ)

ہلتی ہے یوں پلک کہ گڑی دل میں جائے ہے
انداز دیدنی ہے مرے دل نواز کا

(اندازِ دیدنی)

اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو
کھلنا تو دیکھ اس مژۂ نیم باز کا

(مژہ)

ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشک یاسمن
کم گوشۂ چمن سے تری رہ گزر نہیں

(نقش پا)

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ پہنا ہے اس کے بدن کے ساتھ

(لباس)

ان حوالوں سے بقول شکیل الرحمٰن:

''گوشت پوست کا ایک دلنواز، دلکش اور انتہائی پرکشش پیکر خلق ہو جاتا ہے۔''

وہ میر کو ایک مسرت آمیز احساسات کا منفرد شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ شرینگارس کے حوالے سے کہتے ہیں:

''میر کے عاشق کے حسن اور جمالیاتی تجربے شرینگارس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ احساس حسن، رومانیت، غمناکی، عشقیہ تجربے یہ سب عاشق کے حسی

PDF Compressor Free Version

اور جمالیاتی تجربوں میں شامل ہیں۔ میرؔ مسرت آمیز احساسات یا Pleasurable Sensations کے ایک منفرد شاعر ہیں۔''

میرؔ کے بعض اشعار کی تشریح، وہ تمثیل کے حوالوں سے بھی کرتے ہیں اور بعض اشعار کی تشریح کرتے ہوئے وہ مختلف روایت، تاریخی حوالوں اور فکر و فلسفہ سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح جہاں ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں وہ شعر کی تفہیم اور اس کی معنویت میں حسن اور دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً وہ میرؔ کے شعر ۔

ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر
زمین و زماں ہر زماں اور ہے

کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''گوتم بدھ نے کہا تھا تم ایک ہی ندی میں دوسری بار قدم نہیں رکھ سکتے اس لئے کہ تم بدلتے رہتے ہو۔ ہر دوسرے لمحے انسان خود ہی تبدیل ہوجاتا ہے۔ جین ازم کے مطابق چراغ کی لو ہر لمحہ تبدیل ہوتی ہے، یکساں نہیں رہتی، روشنی کا تسلسل تو قائم رہتا ہے، لیکن لو میں تبدیلی بھی مسلسل ہوتی رہتی ہے ہر لمحہ لو کی صورت بدل جاتی ہے..... گوتم بدھ کی بات اس بات سے مختلف ہے کہ ندی یکساں نہیں رہتی ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے، ایک ہی ندی میں دوسری بار قدم نہیں رکھتے اس لئے کہ ندی بدل جاتی ہے۔ ان باتوں کی روشنی میں میرؔ صاحب کے پہلے شعر (یعنی اس شعر) کو پڑھئے تو احساس جمال کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ہوگا، ہر لمحہ بدلتے ہوئے رنگ کا یہ انتہائی خوبصورت احساس ہے۔''

میرؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں:

''میر کی شاعری میں غم ایک گہرا جذبہ ہے جس کا ایک خوبصورت جمالیاتی استعارہ لہو ہے۔''

اور پھر وہ میرؔ کے غم کا غالبؔ کے غم سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''غالبؔ کی شاعری میں غم ہمہ گیر ہے اور لہو ایک آرچ ٹائپ۔ غالبؔ کی شاعری میں لہو کے آرچ ٹائپ کے ابھرتے ہی تجربوں کا رنگ مختلف ہوجاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ غالبؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرنے لگتے ہیں گفتگو کا سلسلہ اچھا خاصا طویل ہوجاتا ہے یعنی انہوں نے بیس سے زیادہ صفحات پر غالبؔ کے کلام کا جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ اگر اس سلسلے میں اختصار سے کام لیتے تو بہتر تھا، کیونکہ ان کا اصل موضوع میرؔ ہیں غالبؔ نہیں۔ اس مختصر کتاب میں ایک تہائی حصے پر غالبؔ کا ذکر مختلف حوالوں سے آتا ہے نیز ان کے اشعار کے حوالے بھی کثرت سے دئے ہیں۔ میرؔ و غالبؔ کی شاعری کا تقابل کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''غالبؔ کا جمالیاتی شعری تجربہ کتنا قیمتی، کتنا اہم اور کس قدر بلند ہے۔ المیہ تجربوں میں بھی غالبؔ وہاں ہیں کہ جہاں اردو کا کوئی شاعر پہنچ نہ سکا، وہ میرؔ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح میرؔ کی بڑائی اور عظمت کم نہیں ہوجاتی۔ میرؔ غالبؔ کے پیش رو ہیں، غالبؔ نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔''

اس کے بعد میرؔ کے تغزل کے حوالے سے تعریف کرتے ہوئے ان کے اس نقص یا عیب کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین کو دہراتے رہتے ہیں بلکہ ایک مضمون کو کئی بار مختلف انداز سے دہرایا بھی ہے۔ یہ اگر نقص ہے تو یہ نقص دیگر شعرا کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ نقص غالبؔ کے یہاں کم ہے، مگر میرؔ کے یہاں زیادہ ہے۔ غالبؔ جب کسی مضمون کو دہراتے ہیں تو اس میں نئی بات پیدا کردیتے ہیں جسے ہم ان کی شاعرانہ فنکاری کی عمدہ مثال کہہ سکتے ہیں جب کہ میرؔ کے یہاں وہ ہمیں محض تکرار نظر آتی ہے جو بعض اوقات شعری حسن سے بھی خالی ہوتا ہے۔ شکیل الرحمٰن اس سلسلے میں کہتے ہیں:

''میرؔ نے تغزل کی آبیاری میں زبردست حصہ لیا ہے۔ وہ شرنگار رس کے تجربوں کے ایک ممتاز شاعر ہیں، لیکن اور بھی کچھ سچائیاں ہیں مثلاً یہ کہ وہ اپنے تجربوں کو بار بار مختلف انداز سے دہراتے رہتے ہیں۔ ایک ہی خیال کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں

PDF Compressor Free Version

جہت دار پہلودار نہیں ہے۔''
شکیل الرحمٰن بڑی شاعری کی پہچان کراتے ہوئے کہتے ہیں:
''میر کے کلام میں ڈرامائی کیفیتیں تو موجود ہیں، مگر وہ ڈراما نہیں ہے جو غالب کے فن میں ہے۔ غالب کے یہاں تو شاعری پہلے ڈراما بنتی ہے اور پھر فکشن بن جاتی ہے۔ یہ بڑی شاعری کی پہچان ہے۔''
شکیل الرحمٰن فکشن کے باب میں بھی المیہ انداز اور ڈرامائی انداز کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ منٹو کے افسانہ ''کھول دو'' کے سلسلے میں لکھتے ہیں:
میرے خیال میں تقریباً ہر اچھی کہانی کی اپنی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا اختتام ایسے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے کہ قاری حیران اور ششدر رہ جاتا ہے۔''
اسی طرح وہ منٹو کے افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:
''یہ قصہ تمثیل کا حسن لئے ہوئے ہے۔ تمثیل کے جوہر نے اس کہانی کو ڈراما بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑا تخلیقی فن ڈرامائی ہوتا ہے۔ اس طرح شاعری ہو یا افسانہ، وہ کامیاب اور عمدہ تخلیق کو ڈراما اور فکشن کی سطح پر لے جاتے ہیں۔''
آخر میں شکیل الرحمٰن نے غزل کے فارم اور ہیئت کی بھی بات کی ہے اور اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں:
''جو لوگ غزل کی مخالفت کرتے ہیں وہ فارم اور ہیئت کے چکر میں زیادہ رہتے ہیں۔ ان کے لئے غالب کی غزلیں ایک جواب کی صورت بھی ہیں اور ایک چیلنج کی صورت میں بھی۔ جو لوگ اپنے نظم نگاروں کی فہرست بناتے رہتے ہیں یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتے کہ ان کا کوئی بھی نظم نگار عمدہ اور جمالیاتی تجربوں کے پیش نظر غالب کے پاس کھڑا ہے یا ان کے کلام کا تاثر غالب کے کلام سے بہتر ہوتا ہے۔ اردو نظم میں اقبال کے علاوہ تو ابھی تک کسی قدآور فنکار نے جنم ہی نہیں لیا ہے۔''
شکیل الرحمٰن کی اس رائے سے اختلاف کی بہت کم گنجائش ملتی ہے۔ اپنی بات بلکہ اپنی کھری کھری بات کا اظہار نہایت جرأت کے ساتھ کر گئے ہیں نیز یہ کہ پیش بندی اور آئندہ کی صورت حال کی طرف بھی واضح اور مثبت اشارہ کر گئے ہیں یعنی ادبی تنقید کے حوالے سے وہ کہہ گئے ہیں:
''ادبی تنقید میں جب تجربوں کے پیش نظر آہنگ اور لفظوں کی شعاعوں کی کیفیتوں کا مطالعہ شروع ہوگا تب ہی سچائی کا زیادہ بہتر علم ہوگا۔''
المختصر، یہ مختصر کتاب میر کے سلسلے میں بڑی مفید اور معلوماتی کتاب ہے۔ اس میں میر کا مطالعہ ایک نئے انداز میں کیا گیا ہے جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ نیز شاعری اور بالخصوص میر اور غالب کے سلسلے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اپنا الگ وزن رکھتی ہیں۔

ہندوستانی جمالیات کی اہمیت

''ہندوستانی جمالیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ سچائی بھی سامنے آئے گی کہ دنیا کو آواز، آہنگ اور روشنی کا اظہار یا ظہور manifestation سمجھا گیا ہے، یہ جمالیاتی فکر و نظر کی بنیادی سچائی ہے۔ سورج اس فکر و نظر کی بنیادی مرکزی علامت ہے۔ 'سوریہ' کے لفظ کا تعلق 'سوَر' (Svar) سے ہے کہ جس کے دو معنی ہیں۔ چمک، روشنی، روشن کرنا وغیرہ اور آواز، آہنگ! سات بنیادی رنگ موسیقی میں سات 'سوروں' سے قریب ہیں۔ 'سوریہ' روشنی اور آواز دونوں کی علامت ہے۔ روشنی اور آواز کی ہم آہنگی 'سوریہ' ہے۔ ہندوستانی جمالیات میں ہر فن میں بیانیہ narrative کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ 'بیانیہ' فن کی روح ہے۔ وہ موسیقی ہو یا رقص یا ڈراما، مجسمہ سازی ہو یا فن تعمیر، سب روحانی تجربہ لگتے ہیں۔ لاشعور میں غالباً یہ عقیدہ پوشیدہ ہے کہ زندگی کا تسلسل قائم ہے۔ ساتھ ہی زندگی کی وحدت بھی موجود ہے۔ ہندوستانی جمالیات نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ انسان اور نیچر کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ انسان اور فطرت، انسان اور وقت اور فضا، انسان اور دیوتا، انسان اور کائنات اور انسان اور انسان، ان میں وحدت موجود ہے۔'' (پروفیسر شکیل الرحمٰن)

PDF Compressor Free Version

شیخ عقیل احمد

Associate Professor, Satyawati College,Univ. of Delhi, Address:262-D
Shipra Sun City, Indrapuram, Ghaziabad 201014 (Mob:09911796525)

شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی بوطیقا

بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن ہندوستانی جمالیات کا تنقیدی استعارہ بن چکے ہیں۔انہوں نے ادب اور فنونِ لطیفہ کی جمالیاتی جہتوں سے اردو کے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔''ہندوستانی جمالیات''میں ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی تہذیبی جمالیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہندوستان جمالیاتی سطح پر دیگر ممالک سے زیادہ زندہ وتابندہ نظر آتا ہے۔''غالبؔ اور ہند مغل جمالیات''میں غالب کی شاعری ہی نہیں بلکہ مغل دور کے فنونِ لطیفہ کی لطافت اور نزاکت پر عالمانہ جمالیاتی ڈسکورس ہے۔''رومیؔ کی جمالیات''اور''حافظؔ کی جمالیات'' تصوف اور روشنی کے فلسفے کی جمالیات پر محیط ہے۔

جمالیات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی تعریف وتوضیح پیش کرنا انتہائی مشکل کام ہے، کیوں کہ اس میں اتنی تہیں اور جہتیں پائی جاتی ہیں کہ ان کی تہوں اور جہتوں کو کھولنا اور ان پر روشنی ڈالنے کا کام کبھی ختم نہیں ہوسکتا ہے۔کوئی ماہر جمالیات اس کی تہوں کو اتنا ہی کھول سکتا ہے اور اس پر روشنی ڈال سکتا ہے جتنا اس کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہوگا۔ شکیل الرحمٰن نے فیثا غورث ،سقراط، ارسطو، لیونارڈ، بوآئیلو(Boileau) بام گارٹن(Baumgarten) ہیگل، نوالس (Novalis) چرنی شاسکی (Chernyshoiski) اور بلسکی(Belinsky) وغیرہ جیسے فلسفیوں کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے جمالیات کی جو توضیح وتشریح پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح کثیر الجہات صورت میں مظاہر قدرت ہے اور سمٹی ہوئی حالت میں خدائے واحد کے مترادف ہے۔جس کی تعریف، توضیح اور تشریح جتنی بھی کی جائے کم ہے۔جس طرح اس دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کا کام ابھی جاری ہے اسی طرح بقول شکیل الرحمٰن ''جمالیات'' کی تعریف، توضیح اور تشریح کا کام بھی جاری ہے اور اس کی معنویت پھیلتی جارہی ہے اور نئی جہتیں مزید نمایاں ہوتی جارہی ہیں۔

شکیل الرحمٰن کے مطابق فنون لطیفہ یا مناظر کائنات کے کسی بھی ذرّہ کے اصل جوہر کی دریافت جمالیات کی مدد کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔فلسفیوں کا خیال ہے کہ کسی بھی شے کا اصل جوہر خدا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمالیات ایک ایسا Tool ہے جس کی مدد سے خدا اور اس کی صفات کو بھی دریافت کیا جاسکتا ہے۔شکیل الرحمٰن نے تو اپنی تخلیقات میں ادب اور آرٹ کے نہ جانے کتنے ہی جواہرات دریافت کیے ہیں، لیکن افسوس کہ شکیل الرحمٰن کی تنقیدی جمالیات کو کماحقہ ابھی تک کسی نے دریافت نہیں کیا ہے۔شاید کم ظرف صوفیوں کی طرح ان کے نقاد بھی راہِ مقام میں ہی بھٹک جاتے ہیں۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن جب بھی سنسکرت جمالیات کے جوہر مثلاً راگ راگنیوں، رس اور رسوں میں شرینگار رس، بھوں اور بھووں میں رتی بھو وغیرہ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ساتوں طبق روشن ہوجاتے ہیں۔انہوں نے عورت کے وجود کو جشن زندگی کا سرچشمہ قرار دیا ہے کیوں کہ عورت کا وجود ایک نغمہ ہے۔اسی کی وجہ سے اردو ادب کو راگ راگنیوں کی خوبصورت متحرک تصویریں حاصل ہوئی ہیں۔سات سروں میں عورت مختلف راگوں کے درمیان ابھرتی ہے۔شکیل الرحمٰن نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا مطالعہ سنسکرت جمالیات کی روشنی میں کیا ہے اور مرکزی جمالیاتی پیکر یعنی عورت کو روشنیوں، خوشبوؤں، رنگوں، راگوں اور راگنیوں کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ راگ راگنیوں کا تعلق ''وقت'' اور موسموں سے گہرا ہے، عورت ہر وقت اور ہر موسم میں ایک نئی میلوڈی ہے۔اسی عورت کے جمال کی وجہ سے قلی قطب شاہ کی شاعری میں شرینگار رس یعنی جنسی لذتوں کا احساس ہوتا ہے۔پروفیسر

PDF Compressor Free Version

شکیل الرحمٰن نے سنسکرت جمالیات کے ماہر بھرت کے ایجاد کردہ اکتالیس بھوؤں کا ذکر کرتے ہوئے ''رتی بھو'' کی اہمیت پر زور دیا جو جنسی محبت کا شدید جذبہ ہے۔ قلی قطب شاہ کی شاعری میں جو شرینگار رس ہے وہ اسی جذبے کی دین ہے۔ قلی قطب شاہ کی شاعری میں ''سیکس'' کے تعلق سے جو لمسی اور حسی احساسات ابھرے ہیں اس سلسلے میں شکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ ان سے انتہائی پرکشش ''جمالیاتی'' فینومینن خلق ہوگیا ہے جس کا تعلق کئی سطحوں پر قاری کے تجربوں اور مشاہدوں سے ہے، اس لیے ان تجربوں سے قاری کو جمالیاتی انبساط حاصل ہونے لگتا ہے۔

شرینگار رس کے چار منازل یعنی ''وکاس''، ''وستار''، ''اہنکار'' اور ''کشوبھا'' کی وضاحت کرتے ہوئے شکیل الرحمٰن نے اچھی تخلیق کو اس کلی سے تعبیر کیا ہے جو آہستہ آہستہ پھول بنتی ہے جسے ''وکاس'' کہا جاتا ہے۔ ''وکاس'' کے بعد پھول سے جب خوشبو پھیلنے لگتی ہے تو ''وستار'' شروع ہوتا ہے۔ ''وستار'' کے بعد پھول کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا حسن اور اس کی خوشبو اپنا اثر دکھانے لگے ہیں تو اس میں ''اہنکار'' پیدا ہوجاتا ہے جو فطری ہے۔ ''وکاس اور ''وستار'' کے بعد ایک قسم کی مستی اور سرشاری آجاتی ہے جس کی کیفیت تیز جھولا جھولنے کی مانند ہوتی ہے۔ یہ شرینگار رس کی آخری منزل ہے جسے ''کشوبھا'' کہا گیا ہے۔ شرینگار رس کے اس نظریہ کی روشنی میں شکیل الرحمٰن نے مرزا شوق کی مثنویوں کا جو مطالعہ پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے اور ان کی جمالیاتی Approach کی خوبصورت مثال ہے۔ شکیل الرحمٰن نے مثنوی ''بہار عشق'' میں اس تجربہ کو کلی کی مانند چٹخنے سے تعبیر کیا ہے جب عاشق لب بام ایک خوبصورت چہرہ دیکھتا ہے۔ یہ ''وکاس'' کی منزل ہے۔ خوبصورت چہرہ دیکھنے کے بعد عاشق اور معشوق کے درمیان کشش محسوس ہونے، ذہنی اور نفسی تصادم، حسی کیفیات اور عشق وغیرہ کے تاثرات کو شکیل الرحمٰن نے ''وستار'' کہا ہے۔ عاشق اور معشوق کے تجربے رفتہ رفتہ جب جمالیاتی تجربے بننے لگے اور معشوق کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس پر کوئی فریفتہ ہوگیا ہے تو اس منزل کو شکیل الرحمٰن نے ''اہنکار'' سے اور جب دونوں کے تعلقات میں ایک خاص طرح کی مستی اور سرشاری پیدا ہوجاتی ہے تو اس منزل کو ''کشوبھا'' سے تعبیر کیا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے اس مثنوی کا تجزیہ شرینگار رس کے ان چاروں منازل کی روشنی میں جس طرح کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت جمالیات پر ان کو دسترس حاصل ہے۔

فراق کی شاعری میں بھی شکیل الرحمٰن نے جنسی محبت کے شدید جذبہ کو دریافت کیا ہے۔ انہوں نے فراق کی شاعری میں دو آرچ ٹائپس (Archetypes) تحرک یعنی ''رات'' اور ''عورت'' کی موجودگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دونوں فراق کی سائیکی میں اترے ہوئے ہیں اور ان کی جمالیات مختلف رنگوں اور جہتوں کے ساتھ نمایاں ہوتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے فراق کا وجود رقص کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے فراق کی جمالیات میں عورت، اس کے جسم اور اس کے پورے وجود کو جمالِ کائنات کا نقش قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس عمل میں ''سیکس'' کی لہروں کی شدت موجود رہتی ہے۔ شکیل الرحمٰن کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہر سنسکرت جمالیات بھرت کے ایجاد کردہ انتہائی پراثر ''رتی بھو'' کے ارتعاشات فراق کی شاعری میں بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے فراق کی شاعری میں انتہائی پرکشش ''جمالیاتی'' فینومینن خلق ہوگیا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے ہندوستانی جمالیات اور بدھ مفکر و معلم جمالیات اشوگھوش کے حوالے سے، جس نے فنی تخلیق سے جمالیاتی انبساط پانے کی جانب اشارے کیے تھے، ''مہاسکھا'' کی اصطلاح سے جمالیاتی انبساط کو سمجھاتے ہوئے کہا ہے کہ فراق کی شاعری سے وہی انبساط حاصل ہوتا ہے جو ''یوگ اور سیکس کی ہم آہنگی کے تجربے سے ہوتا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے ''آہنگ'' کو موسیقی کی اصل روح قرار دیا ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی شے نہیں ہے جس میں ہم آہنگی موجود نہ ہو۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا کو آواز، آہنگ اور روشنی کا ظہور سمجھا گیا ہے۔ سورج اس فکر و نظر کی بنیادی مرکزی علامت ہے۔ انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ سورج کی روشنی کے ساتوں رنگ موسیقی میں سات ''سروں'' سے قریب ہیں۔ ''سوریہ'' روشنی اور آواز دونوں کی علامت ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ روشنی اور آواز کی ہم آہنگی سوریہ ہے۔

دنیا کی تمام مقدس یا آسمانی کتابوں میں بھی اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایک خاص نظام کے تحت اس

PDF Compressor Free Version

کائنات کی تخلیق کی اور تخلیق کردہ موجودات میں ہم آہنگی پیدا کی۔ مثلاً چاند، سورج اور زمین اپنے اپنے مدار میں ایک دوسرے کی گردش ایک نظام کے تحت کرتے ہیں جس کی وجہ سے صبح ہوتی ہے، دن ہوتا ہے، شام ہوتی ہے پھر رات ہوتی ہے اور یوں ہی وقت گزرتا رہتا ہے یعنی ان تینوں سیاروں میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ان میں ہونے والے تغیرات کے اثرات بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر بے شمار چیزوں پر پڑتے ہیں۔ آسمان، زمین اور سمندر میں پائی جانے والی ایسی کوئی چیز نہیں ہے جن کا رشتہ دوسری چیزوں سے نہ ہو اور ان میں ہونے والے تغیرات کے اثرات ایک دوسرے پر نہ پڑتے ہوں اور ان تمام چیزوں میں ہم آہنگی نہ پائی جاتی ہو، لہٰذا کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے انسانی رشتے قائم نہ ہوسکیں۔ اس کی وضاحت علامہ اقبالؔ نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کی ہے ۔

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

شکیل الرحمٰن نے شاعری میں ''آہنگ'' کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ شاعری میں اکثر دو مصرعے جب ایک دوسرے میں جذب ہوجاتے ہیں تو بہاؤ کے ساتھ ایک جذبہ خلق ہوجاتا ہے، آہنگ کی ایک جمالیاتی تصویر ابھر آتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے آہنگ کے کرشمے کو فراقؔ کی شاعری میں دریافت کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فراقؔ نے اودی روایات کے جلال و جمال کے آہنگ کی مکمل طور پر نمائندگی کی ہے۔ ان کی شاعری میں لفظوں کی تکرار نے شاعر کی حسی اور لمسی کیفیتوں کو تخلیقی سطح پر حد درجہ محسوس بنادیا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے فراقؔ کی شاعری میں ''شب'' اور ''شام'' کے استعمال سے عجیب و غریب کیفیت پیدا ہونے پر گفتگو کرتے ہوئے رات کے فلسفہ پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اور اس کی خوبیوں اور پراسرار کیفیتوں کی وضاحت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات کی تاریکی کو دن کی روشنی پر ترجیح دیتے ہیں۔ انہوں نے بعض مذہبی خیالات کے حوالے سے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن کی روشنی سے رات کو جنم دیا ہے، لیکن بے شمار مثالوں اور دلیلوں سے رات کی تاریکی کو دن کی روشنی سے افضل قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ممتاز مصور Vincent Van Gogh کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ رات دن سے زیادہ زندہ اور مختلف گہرے رنگوں کو لیے ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت انہوں نے اس طرح کی ہے:

> ''اس کی تصویروں میں اکثر محسوس ہوتا ہے جیسے رات ابدی حسن کے اسرار لیے سرگوشی کررہی ہے۔ شب کی عطا کی ہوئی تاریکی جتنی گہری اور پراسرار ہوتی ہے اتنی دن کی روشنی نہیں ہوتی۔ دن کی روشنی میں وہ تہداری کہاں جو رات کی تاریکی میں ہے۔ شب کے اسرار اور اس کی تاریکی سے جو جمالیاتی لذت اور انبساط حاصل ہوتا ہے وہ روح میں جان پرور کیفیت پیدا کردیتا ہے۔''

اسی لیے شکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ فراقؔ کی شاعری میں:

> '' شب، شام اور احساس و ادراک کی ہم آہنگی اور وحدت سے ایک عمدہ جمالیاتی منظرنامہ سامنے آگیا ہے، جس سے حسی سطح پر جذباتی رومانی قدروں کا مطالعہ جمالیاتی انبساط بخشنے لگتا ہے۔''

انہوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ فراقؔ نے شب اور آہنگ شب سے جو باطنی رشتہ قائم کیا ہے اس سے ان کی شاعری میں میلوڈی پیدا ہوگئی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے فراق کی شاعری کو کئی رسوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے ادب اور آرٹ کی تخلیق میں اساطیر کی اہمیت پر زور دیا ہے کیوں کہ شاید ہی کوئی اعلیٰ درجہ کا ادب یا فن لطیف ہو جس کی تخلیق میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اساطیر کے اثرات موجود نہ ہوں۔ شکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ اساطیری روایت اور کردار تخلیق کار یا فنکار کے لاشعور کی گہرائیوں میں موجود رہتے ہیں۔ اجتماعی یا نسلی شعور سے اساطیر کی لہریں نامحسوس طور پر آتی رہتی ہیں اور شعور کو متاثر کرتی رہتی ہیں، اسی لیے کوئی بھی بڑا تخلیقی فنکار اساطیر سے گریز نہیں کرسکتا۔ اسی لئے انہوں نے اساطیر کو ایک خاموش متحرک روایت سے تعبیر کیا ہے جس کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے اور تخلیقی آرٹ کا باطنی رشتہ کسی نہ کسی سطح پر اساطیر اور اس کی روایت سے قائم رہتا ہے۔ ''آرچ ٹائپ'' کی توضیح و

PDF Compressor Free Version

تشریح پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ تخلیقی فنکاروں کی حسی اور نفسی کیفیتوں کی شدت سے آرچ ٹائپ میں تحرک پیدا ہوتا ہے اور بنیادی اور قدیم علامتیں اپنی تہداری اور معنی خیز جہتوں کے ساتھ نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ شکیل الرحمٰن نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ لوک کہانیوں کی جڑیں اساطیر کی گہرائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو بے جڑ کا پودا قرار دیا ہے جو متھ اور لوک کہانیوں کے بغیر رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لوک کہانیاں اعلیٰ درجہ کی جدید تخلیق کا سرچشمہ ہیں۔

لوک کہانیوں میں فینتاسی کی خاص اہمیت ہے، بلکہ اس کے بغیر لوک کہانیوں کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لوک کہانیوں کے اثر سے فینتاسی اردو کی کلاسیکی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن اردو کے پہلے ناقد مولانا حالی نے ادب میں فینتاسی (Fantasy) کی تخلیق یا مافوق الفطرت عناصر کے استعمال پر سخت تنقید کی تھی کیوں کہ یہ خواب وخیال کی دنیا خلق کرتی ہے جو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اس کے بعد تمام ناقدین نے مولانا حالی سے اتفاق کرتے ہوئے فینتاسی کو ادب میں ممنوع قرار دے دیا، لیکن شکیل الرحمٰن ناقدین کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔

فینتاسی کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ تخلیقی فکر ونظر کی ایک صورت ہے اور انسان کی نفسیات سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے کارل مارکس کے حوالے سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ انسان کی ترقی اور اس کی فکری ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی اہمیت صرف ادبیات ہی میں نہیں بلکہ مصوری، موسیقی، فیزکس اور علم ریاضی میں بھی ہے۔

شکیل الرحمٰن نے اسے ذہن کا وہ نفسیاتی عمل قرار دیا ہے جس سے نئی دور بینی پیدا ہوتی ہے اور وژن نئی صورتوں کو پانے لگتا ہے۔ کلیات غالبؔ اور اردو کی کلاسیکی مثنویوں میں شکیل الرحمٰن نے فینتاسی کے کمالات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے مطابق اردو ادب میں غالبؔ فینتاسی کے سب سے بڑے تخلیقی فنکار ہیں جن کی سائیکی نے ''امیجری'' کو صرف خلق ہی نہیں کیا بلکہ اسے توانائی بھی بخشی۔ غالبؔ کے علاوہ فینتاسی کی عمدہ مثالیں اردو کی کلاسیکی مثنویوں میں ملتی ہیں۔ دراصل ان مثنویوں کا تعلق عوامی قصوں اور دیومالا سے بھی رہا ہے، اسی لئے مثنوی نگاروں نے ان قصوں میں تصادم اور کشمکش کی پیشکش کے لیے فینتاسی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

شکیل الرحمٰن نے ''کدم راؤ پدم راؤ''، ''قطب مشتری''، ''سیف الملوک اور بدیع الجمال''، ''چندر بدن اور مہیار''، ''پھول بن''، ''گلشن عشق'' اور ''طوطی نامہ'' وغیرہ مثنویوں میں فینتاسی کے جو جوہر ملتے ہیں ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان مثنویوں میں جو فینتاسی پیدا کی گئی ہے، وہ اس لیے بھی پرکشش ہیں کہ ہمارے لاشعور میں ان کا حسن اور ان کے تحیر کا حسن موجود ہے۔ فینتاسی کے کرداروں کی نفسیات یا ان کے ہیجانات ہم سے علاحدہ نہیں ہیں کیوں کہ مسرتوں اور اداسیوں کی نہ جانے کتنی داستانیں ہم اپنے لاشعور میں لیے پھرتے ہیں۔ غرض پروفیسر شکیل الرحمٰن کی تنقید ہندوستانی تہذیب کی جڑوں سے وابستہ ہے۔

سنسکرت جمالیات میں ''اَدبھت رس'' یعنی تحیر کی جمالیات کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے ابھینو گپت، بھرت منی، ممٹ اور اچاریہ نارائن کے حوالوں کی روشنی میں اَدبھت رَس یا چمتکار رس یا ''لوکوٹ تارا (Lokottara)'' پر جس طرح بحث کی ہے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اسے پڑھ کر قاری خود اَدبھت رَس میں ڈوب جاتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت جمالیات پر ان کی نظر کتنی گہری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تحیر رسوں کا نقطہ عروج ہے، تحیر کی جمالیات کے بغیر کسی بھی اعلیٰ فن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیقی آرٹ میں تحیر کی جمالیات قاری کے ذہن میں کشادگی پیدا کر کے اسے ایک افضل سطح پر لے جاتی ہے۔ یہ وہ سطح ہے جو زندگی کے جلال و جمال کو صرف حد درجہ متقوی ہی نہیں بناتی بلکہ زندگی کے حسن کو دیکھنے کے لیے ایک وژن بھی عطا کر دیتی ہے۔''

انہوں نے غالبؔ کی ''مثنوی چراغ دیر'' کا مطالعہ اَدبھت رس یعنی تحیر کی

PDF Compressor Free Version

جمالیات کی روشنی میں کر کے غالبؔ کی تنقید کا ایک نیا پہلو ایجاد کیا ہے۔ غالبؔ کی مثنوی میں جو تحیر کی کیفیت پائی جاتی ہے اس پر گفتگو کرتے ہوئے شکیل الرحمٰن نے کہا ہے کہ کالی داس نے اپنی شاعری میں تحیر پیدا کرنے کے لیے پرانی ایپک سے فوق الفطری کیفیتوں کا سہارا لیا تھا، لیکن غالبؔ اپنی شاعری میں ادبھت تجربوں کے لیے کسی رزمیہ یا ایپک کے پاس نہیں گئے بلکہ اپنی سائیکی کی مدد سے شاعری میں اَدبھت رس یا تحیر پیدا کیا جس نے ان کی شاعری کو عظیم سے عظیم تر بنا دیا۔

شکیل الرحمٰن نے غالبؔ کی مثنوی ''چراغِ دیر'' کے کینوس میں تین رنگوں کو دریافت کیا ہے جس میں پہلا سرخ رنگ جو جبلت کا رنگ ہے، دوسرا آسمانی جو آسمان کا رنگ ہونے ساتھ ساتھ روح اور باطن کا رنگ بھی ہے اور تیسرا اس سرخ اور نیلے کے امتزاج سے بنا ہے یعنی بنفشی (Violet) جسے صوفیانہ فکر کا رنگ کہا جاتا ہے۔ ان رنگوں کی موجودگی نے مثنوی میں جو جمالیاتی وحدت پیدا کی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر شکیل الرحمٰن نے کہا ہے کہ اس سے حیرت انگیز مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان رنگوں کی مدد سے بنارس کے حسن کا تحیر کے پس منظر میں جو جمالِ زندگی کی علامت ہے، جس طرح جلال و جمال کے تحیر کو ابھارا گیا ہے، وہ یقینی طور پر ایک بڑے تخلیقی فنکار ہی کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے غالبؔ کا تہذیبی مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ غالبؔ ایک تہذیب کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور وہ ہند مغل جمالیات کی زندہ مثال تھے۔ ان کے شعور اور لاشعور میں داستان ایک مستقل روایت کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے ان کی شاعری اور نثری تخلیقات میں اساطیری اور داستانی رجحان حد درجہ متحرک ہے۔ غالبؔ دراصل ایک ایسا تخلیق کار تھا جنہوں نے برصغیر کے بے شمار قصوں، کہانیوں اور داستانوں کی عظیم روایتوں سے تخلیقی نوعیت کا رشتہ قائم کر رکھا تھا جن کا انعکاس ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔ شکیل الرحمٰن نے غالبؔ کی نثری اور شعری تخلیقات سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں جن میں دیومالا، قصص، مذہب اور امیجری کی وہ کائنات ہے جو داستانیت کے تحیر اور اس کی فینتاسی (Fantasy) سے تخلیقی رشتہ رکھتی ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کے مطابق غالبؔ کی تخلیقات میں جو فکر کی توانائی اور تخیل کی بلند پروازی پائی جاتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ نے ہند مغل تہذیب کی بے پناہ گہرائیوں میں اپنی جڑیں پھیلا رکھی تھیں۔

روشنی، رنگ اور رفتار کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ روشنی میں کئی رنگ پنہاں ہیں، لیکن اس کی رفتار شدید تیز ہونے کی وجہ سے اس کے رنگ نظر نہیں آتے ہیں، البتہ انہیں Prism یا قوسِ قزح میں دیکھا جاسکتا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے اقبالؔ کی شاعری میں استعارہ کے طور پر روشنی کے استعمال کی فلسفیانہ توضیح پیش کی ہے۔ دراصل اشراقی فلسفہ کے مطابق نورِ اعلیٰ تمام حرکات کا مبدا ہے اور حرکت کا سبب منور کرنے کی خواہش ہے اور یہی وہ خواہش ہے جو نور کو مضطرب کر دیتی ہے تاکہ یہ اپنی شعاعوں کو تمام چیزوں پر منعکس کر کے ان کی زندگی میں ایک روح پھونک دے۔ اس سے جو تجلیات نمو کرتی ہیں ان کی تعداد لامحدود ہوتی ہے اور ایسی تجلیات جن کی روشنی شدید ہوتی ہے وہ دوسری تجلیات کا سرچشمہ بن جاتی ہیں۔ گویا یہ کائنات ایک سایہ ہے ان بے پناہ تجلیوں کی شعاعوں کا جو نورِ اعلیٰ سے آتی ہیں۔ کائنات کی اشیا میں ان تجلیوں کے سبب جن کی جانب یہ مستقل حرکت میں رہتی ہیں ایک عشق کا جذبہ نمو پاتا رہتا ہے تاکہ وہ حقیقی نور کے سرچشمہ سے مستفیض ہوتی رہیں۔ یعنی یہ کارخانہ عالم محبت و عشق کا ابدی ڈرامہ ہے، اسی لیے شکیل الرحمٰن نے اشارہ کیا ہے کہ اقبالؔ کی شاعری میں عشق ایک ہمہ گیر تخلیقی جذبہ ہے اور عشق کی گرمی سے ہی معرکہ کائنات ہے۔ اقبالؔ کے اس شعر۔

عشق کی جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

پر تبصرہ کرتے ہوئے شکیل الرحمٰن نے ''روشنی'' کی جمالیات کی توضیح اس طرح کی ہے کہ عشق سے روشنی کا شعور حاصل ہوا اور تنویر نگاہ سے کائناتی جلووں کی پہچان ہوئی اور لامکاں کی روشنیوں کا ادراک حاصل ہوا۔ انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ نگاہ، نگاہِ شوق اور نظر بطور استعارہ استعمال ہونے کے پیچھے ''روشنی'' کا ''آرچ ٹائپ'' حد درجہ متحرک ہے۔ شکیل الرحمٰن نے فکر و فلسفہ کی جس بلندی پر پہنچ کر اقبالؔ کی شاعری میں روشنی، رنگ اور رفتار بطور استعارہ اور علامت استعمال کیے

PDF Compressor Free Version

جانے کا جو جواز پیش کیا ہے، وہاں تک پہنچنے میں بڑے سے بڑے ماہر اقبالیات کی پوری زندگی ختم ہوجائے گی۔ انہوں نے مطالعہ اقبال کا نظریہ ہی بدل دیا ہے۔

امیر خسرو حسن ازلی، حسن انسانی اور حسن حیات وکائنات کے ایک بڑے شاعر ہیں، حسن کے مظہر کے عاشق ہیں اور ''ہیومنزم'' (Humanism) ان کے کلام کا اصل جوہر ہے کیوں کہ انسان ہی وہ مخلوق ہے جو حسن مطلق اور حسن کائنات کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا وژن رکھتا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے انسان کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہہ کر کہ:

''انسان روح کی مانند کائنات میں سما جاتا ہے اور اس میں تحرک پیدا کر دیتا ہے اور یہ بھی سچائی ہے کہ یہ دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ انسان کا وجود اس میں سما ہی نہیں سکتا۔''

ابن عربی کے اس قول کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ انسان خدا کا آئینہ ہے اور خدا انسان کا آئینہ ہے۔ تبھی تو انسان کا وجود اتنی چھوٹی سی دنیا میں سما نہیں سکتا ہے۔ انسان روح کی مانند دنیا میں سما کر تحرک پیدا کر سکتا ہے تو پھر وہ انسان ہی ہے جو کائنات کی ہر شے کے جمال اور زندگی کے تمام رنگوں کا عاشق ہے۔ امیر خسرو نے اپنی شاعری میں رنگ اور روشنی کے علاوہ سیاہی یا ظلمت کے حسن کو بھی پہچاننے کی بات کہی ہے۔ دراصل فلسفیوں کا خیال ہے کہ ظلمت کوئی ایسی متمائز شے نہیں جو کسی قائم بالذات ماخذ سے ظہور کرتی ہو بلکہ نور کے اثبات میں ہی اس کی نفی پوشیدہ ہے، یعنی یہ خود کو قائم رکھنے کے لیے ظلمت کو منور کر دیتا ہے۔ اسی لیے شکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ سیاہی کے حسن کے جلوے کو بھی جس نے پہچان لیا دراصل وہی صاحب فکر ونظر ہے، جمال وجلال کا رسیا ہے، خالق کی تخلیقات کے حسن کا حصہ اور جوہر ہے۔

شکیل الرحمٰن نے امیر خسرو کی جمالیات کے ضمن میں جس طرح انسان کی عظمت، مظاہر خدا اور مناظر کائنات پر روشنی ڈالی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف کے رموز سے بخوبی واقف ہیں۔

شکیل الرحمٰن اپنے ہر مضمون میں ایک نیا زاویہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اسلوبیات کے موضوع پر اب تک جتنی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں ان میں تمام ماہرین اسلوبیات نے صرف خارجی پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے، لیکن شکیل الرحمٰن نے ''ترجمان القرآن'' کے اسلوب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کے باطنی پہلو کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم میں روح کی جو اہمیت ہے وہی اہمیت اسلوب میں باطنی پہلو کی بھی ہے جس کی بہترین مثالیں مولانا ابوالکلام آزاد کی تخلیقات میں موجود ہیں۔

شکیل الرحمٰن کے مطابق ''ترجمان القرآن'' کا اسلوب جو ابلاغ کا اپنا حسن رکھتا ہے، تزکیہ نفس بھی کرتا ہے اور ایک معروضی Objective زاویہ نگاہ بھی عطا کرتا ہے۔ شکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ اب تک قرآن کی متعدد تفسیریں لکھی جا چکی ہیں، لیکن ان میں بیشتر تفسیروں کا اسلوب عربی آمیز ہے۔ وہ اردو کلچر میں پوری طرح ڈھل نہیں پائی ہیں جس سے بعض مفاہیم کی تشریح پیچیدہ معلوم ہوتی ہے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کے آہنگ کو اپنی شخصیت میں پوری طرح جذب کر کے اس کے دقیق سے دقیق مسائل کو بھی اس کی اصل روح کو برقرار رکھتے ہوئے اردو تہذیب کے سانچے میں ایسے ڈھال دیا ہے کہ اسے پڑھ کر بعض ایسی سچائیاں اور حقیقتیں قاری پر منکشف ہوجاتی ہیں کہ آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔

شکیل الرحمٰن نے جہاں مولانا کی اردو زبان وادب پر بے پناہ قدرت کی بات کہی ہے وہیں اردو کلچر اور زبان کی توانائی اور برقی کیفیتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، کس طرح قرآن کا جلال وجمال اردو کے سانچے میں ڈھل گیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''قرآن مجید کی پاکیزہ خوشبوؤں سے قاری کے احساس و شعور اور اس کے پورے وجود کو معطر کرنے کا جو اسلوب مولانا نے خلق کیا ہے وہ ان کی پچھلی تحریروں کے اسالیب سے مختلف تو ہے ہی، تسویہ، مطابقت اور ہم آہنگی Harmony کا بھی منفرد اور خوبصورت نمونہ ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' کے علاوہ ''غبار خاطر'' میں بھی نثری اسلوب کا جادو جگایا ہے۔ احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند ہونے کے دوران لکھے گئے تمام مضامین یقیناً ان کے دل کے غبار ہی ہیں، لیکن مولانا نے اس غبار کو نثر کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے قلعہ کے بند

PDF Compressor Free Version

کمرے میں اپنی ایک الگ دنیا بنائی جس میں قدرت کے تمام رنگین نظارے، قطار در قطار خوشبو بکھیرتے ہوئے پھول اور نغمے گاتے ہوئے پرندے موجود تھے، اس لیے ان کے نثری اسلوب میں ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ ہر شخص اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ ''غبار خاطر'' کی نغمگی اور خوشبو نے شکیل الرحمٰن کو بھی اپنی طرف کھینچا اور انہوں نے مولانا کے مضامین میں ان کی رومانیت کو دریافت کیا۔ مولانا کی رومانیت کو دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ شکیل الرحمٰن نے رومانیت کی جمالیات کی طرف جو اشارے کیے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''رومانیت انجمن سے نکل کر تنہائی کی ایسی فضا چاہتی ہے، جہاں احساسات پر کسی قسم کی گرفت نہ ہو۔''

شکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ:

''رومانی فنکار کو اپنے باطن کی سرمستیاں اس قدر عزیز ہیں اور وہ انہیں اس قدر عزیز جانتا ہے کہ انہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا ہے۔ رومانیت باطن کی آگہی ہے۔ باطن کی روشنیوں کے تئیں بیداری ہے۔''

شکیل الرحمٰن نے مولانا کی رومانیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فطرت کا حسن اور انسان کی تخلیقات کا حسن، دونوں فنکار کی رومانیت کو بیدار اور متحرک کیے رہتے ہیں۔ مولانا کی رومانیت میں علم کا دباؤ نہیں ہے اور حسن سے ایک معصوم سا رشتہ قائم ہے۔ علم سے جو آگہی حاصل ہوئی ہے اور حسن کو دیکھنے و محسوس کرنے کا جو وژن ملا ہے اس کا جوہر بھی ان کی رومانیت میں موجود ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کے تنقیدی تحرکات کی یہ چند تمثیلیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تنقیدی لہروں کی دریافت کے لیے سمندر کی سطح چاہیے۔ ان کی تنقید میں ایک نئی روح ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کا تنقیدی اسلوب دوسروں سے بالکل منفرد ہے، وہ فکشن کی زبان میں تنقید لکھتے ہیں، اس لیے ان کی تنقید بنیادی طور پر تخلیقی تنقید ہے، ان کی بعض عبارتیں تو ایسی ہیں جنہیں پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ نثر نہیں شعری واحدے ہیں۔

اقوال شکیل

☆ ''جو لوگ غزل کی مخالفت کرتے ہیں وہ فارم اور ہیئت کے چکر میں زیادہ رہتے ہیں۔ ان کے لئے غالب کی غزلیں ایک جواب کی صورت بھی ہیں اور ایک چیلنج کی صورت بھی۔ جو لوگ اپنے نظم نگاروں کی فہرست بناتے رہتے ہیں۔ یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتے کہ ان کا کوئی بھی نظم نگار عمدہ اور جمالیاتی تجربوں کے پیش نظر غالبؔ کے پاس کھڑا ہے یا ان کے کلام کا تاثر غالبؔ کے کلام سے بہتر ہوتا ہے۔ اردو نظم میں اقبال کے علاوہ تو ابھی تک کسی قد آور فنکار نے جنم ہی نہیں لیا ہے۔''

☆ ''فنتاسی ذہن کا وہ نفسیاتی عمل ہے کہ جس سے نئی دردوں بنی پیدا ہوتی ہے اور 'وژن' نئی صورتیں کا پانے لگتا ہے۔ 'فنتاسی' کے تعلق سے ذہن جس قدر گہرائی میں اترتا ہے 'فنتاسی' اتنی ہی پراسرار بنتی جاتی ہے۔ یہ تخیل کی دین ہے۔

☆ ''جمالیاتی تجربہ یا کسی موضوع یا عنصر کا جمال، حاسہ کے ذریعے پہلے تخیل میں تحرک پیدا کرتا ہے اور پھر تخیل ایک سے زیادہ رنگوں کے تئیں بیدار ہوتا ہے، تخیل بلاشبہ جمالیاتی تجربے کی ایک اہم ترین سطح ہے۔ جیسے جیسے فنکار جمالیاتی عنصر یا موضوع یا تجربے کے ساتھ ساتھ اوپر اٹھتا ہے، حسیات کی سطح سے شعاعیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ تخیل کی سطح تک آتے آتے شعاعوں کے رنگ ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس پورے عمل میں فنکار کی شخصیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ تخلیقی عمل میں ان جمالیاتی تاثرات کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے جو تخیل کے سبب ابھرتے یا جنم لیتے ہیں، تخلیق کی تکمیل ہوئی اور ایک دنیا وجود میں آگئی۔ یہ دنیا فن کار کی تخلیق ہوتی ہے۔''

PDF Compressor Free Version

اظہار خضر

Diwan Mohalla, City Court, Patna

تفہیم جمالیات کا ایک درخشاں پہلو: تصوف کی جمالیات

علم ودانش کی حامل تحریریں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں اطلاعات ومعلومات کا ایک وسیع ذخیرہ ہوتا ہے اور دوسری اقداری ہوتی ہیں۔ پہلی نوع کی تحریر محرر کے وسیع مطالعے کی غماز ہوتی ہے۔ اس کے تصنیفی عمل کا مرکز ومحور ان اطلاعات ومعلومات کو بہم پہنچانا ہوتا ہے جو قاری کے علم میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ ادب کو چھوڑ کر دیگر موضوعات پر کی جانے والی خامہ فرسائیاں اسی زمرے میں آتی ہیں، حالانکہ جزوی طور پر اس کا اطلاق ادب کی ان تحریروں پر بھی ہوسکتا ہے جن میں تحقیقی طریقہ کار کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ ان میں حقائق کے حوالے سے متن کی صحت پر محقق کی نظر جمی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ جو ادبی اشاریے تیار کئے جاتے ہیں وہ بھی اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان سب تحریروں کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن ان میں فکر ونظر کے روشن ہونے کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے، جب کہ ادب اور بالخصوص فنون لطیفہ کے حوالے سے لکھی جانے والی تحریروں میں فکر ونظر کے روشن ہونے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ ترسیل قدر ہے۔ یعنی فنونِ لطیفہ سے عبارت تحریریں قدروں پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان میں اطلاعات ومعلومات بھی بہم پہنچائی جاتی ہیں، لیکن قلم کار ان کی کشید کرتا ہے، نتائج اخذ کرتا ہے، ان کے مضمرات، اثرات کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس کے بعد فن کے وسیلے سے ایک نظام اقدار کی تشکیل کرتا ہے جس میں اس کے لطیف حسیاتی عناصر بکھرے رہتے ہیں۔

یہی وہ عناصر ہیں جو اپنے فکری ارتعاشات کے وسیلے سے قاری کے رباب دل کو چھیڑتے ہیں۔ فن لطیف کا فن کار اور اس کی بوطیقا پر تنقید لکھنے والا ناقد دونوں ہی اس تصنیفی ہنرمندی سے باخبر رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو فکر وفن کے ترسیلی عمل سے اثر انگیزی کی کیفیت ختم ہوجائے گی۔ کیونکہ یہ اثر انگیزی ہی کا کرشمہ ہے کہ قدروں کی سطح پر ایک جمالیاتی نظام کی تشکیل ہوتی ہے جو فن لطیف کی بنیادی قدر ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کی حالیہ کتاب ''تصوف کی جمالیات'' (مطبوعہ: ۲۰۰۳ء) فکر وفن کے اسی منظر نامے کو مرتب کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی بنیادی حیثیت اقداری ہے، لیکن اس میں تصوف اور اس کے ادب کے حوالے سے معلومات کی ایک دنیا بھی آباد ہے۔ یہ شکیل صاحب کے فن نگارش کا کمال ہے کہ انہوں نے متصوفانہ سرگرمیوں اور ان سے متعلق تحریروں میں جمالیاتی قدروں کی بازیافت کر کے مطالعے کی سطح پر تصوف کے موضوع کو ایک نئی جہت بخشی ہے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب اپنے موضوع کی تازگی اور ندرت فکر کے لحاظ سے علم وادب کے سنجیدہ قارئین کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ دراصل شکیل صاحب کی تصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ جمالیاتِ ادب ہے۔ وہ اس کی نئی نئی شقیں دریافت کرتے رہتے ہیں اور ان کے وسیلے سے قاری فکر کی نئی نئی بصیرتوں سے روشناس ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے تنقید ادب میں ان کی جمالیاتی تحریریں عصری تقاضوں کی نئی سماجی اور تہذیبی بصیرتوں کے اشاریہ ہیں۔ ان میں ان کے معقولیت پسندانہ ذہنی رویے حد درجہ متحرک نظر آتے ہیں۔ معقولیت پسندی ان معنی میں کہ انہوں نے جمالیاتی تناظر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری زندگی کی گوناگوں سرگرمیوں ہی سے ماخوذ ہے کیونکہ ادب کوئی مجرد شے نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں کسی مافوق الفطری اور طلسماتی دنیا کی سیر کراتا ہے بلکہ یہ زندگی کی سچائیوں کو فن کے روپ میں پیش کر کے ایک بہترین نظام اقدار کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی علم وادب کا بنیادی فریضہ ہے اور اسی کے توسط سے اصحابِ علم وفن کی تحریریں قاری کی فکری اور علمی سطح کو بلند کرتی ہیں۔ اب آپ غور فرمایئے کہ کیا شکیل الرحمٰن کی تحریریں

PDF Compressor Free Version

فنتلسی ہیں یا پھر ان میں زندگی کے حسن اور اس کی نیرنگیوں کے ادراک و عرفان کے ایک بالیدہ فہم وشعور کی کارفرمائیاں ملتی ہیں۔ میرا خیال ہے اور شاید آپ بھی اس امر پر متفق ہوں گے کہ حسن و جمال کی تمام تر گفتگو زندگی کی بوقلمونیوں سے ہی ماخوذ ہوتی ہے، لہٰذا جب گفتگو کا مرکز ومحور زندگی اور کائنات ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس میں عصری صداقتوں کی آہٹیں اور دھڑکنیں صاف طور پر سنائی پڑیں گی، لیکن چونکہ اس وقت میرا موضوع سخن ان کی زیر بحث کتاب ''تصوف کی جمالیات'' ہے اس لئے اس کے حوالے سے چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

تصوف کی جمالیات کی جو اصطلاح انہوں نے وضع کی ہے وہ اپنے آپ میں ایک بصیرت افروز جمالیاتی تجربہ ہے جس میں ان کا فکری آمیزہ ذکی الحسی کی تیز آنچ میں تپ کر سبلائم ہو جاتا ہے۔ عامیانہ پن سے گریز اور غیر معمولی افکار وخیالات کا اظہار ہی Sublimity ہے۔ شکیل صاحب نے اپنی تحریروں میں اس بنیادی نکتے کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہ ظاہر تو شکیل صاحب کی متذکرہ وضع کردہ اصطلاح ارباب نظر کو مغالطے میں ڈالنے کا سبب بن گئی ہے، کیونکہ اس سے تکرار قدر کا شدید گمان ہوتا ہے، حالانکہ تصوف آج باضابطہ ایک علاحدہ فیکلٹی کی صورت میں تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ ایسی صورت میں اس سے متعلق کی جانے والی گفتگو کی ایک آزادانہ حیثیت ہونی چاہئے۔ اب مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ زندگی اور فطرت جلال و جمال کی عکس ریزیوں کا ایک دلکش الوہی منظرنامہ ہے۔ اسی میں کائنات کا حسن پوشیدہ ہے۔ ہماری زندگی کی سانسیں اس حسن کی دلآویزیوں کی مرہون ہیں۔ ہم کائنات کی تمام مخلوقات میں پنہاں قوت مدرکہ کو خالق کی تخلیق کا حسن تصور کرتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہر تخلیق کا اپنا ایک نمایاں وصف ہوتا ہے جس کو اس کے حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ حسن بہ رنگ نشاطیہ بھی ہوتا ہے اور بہ رنگ المیہ بھی۔ جلال و جمال کا فکری تصور اسی سے ماخوذ ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ حسن کے اس تفاعل کی نوعیت مختلف اشیا میں کس انداز سے اپنی تخلیقی انفرادیت وضع کرتی ہے۔

مرد کا حسن اس کی مردانہ وجاہت اور جاہ وجلال، عورت کا حسن اس کی نسائیت اور عصمت و پاکیزگی، تاج محل کا حسن اس کے فن معماری کے وہ بہترین لطیف فنی نمونے ہیں جو اس کی جمالیاتی قدروں کو ابھارتے ہیں۔ اسی طرح ادب کے مختلف اصناف کا حسن ان کی اپنی اپنی تخلیقی انفرادیت میں مضمر ہے۔ مثلاً غزل کا حسن اس کا تغزل، کہانی کا حسن اس کا کہانی پن، ڈرامے کا حسن اس کا مکالماتی انداز بیان، نظم کا حسن اس کا ربط و تسلسل اور مذہب کا حسن تصوف۔ پروفیسر حسین الحق نے اپنے مضمون ''مذہب، تصوف اور تہذیب: سیل خیال کی ایک تحریری ہیئت'' (مطبوعہ سہ ماہی ''دیوان'' پٹنہ بابت جنوری ۲۰۰۳ء) میں اس موضوع پر چند فکر انگیز نکات پیش کئے ہیں۔ میں پروفیسر موصوف کے پیش کردہ نکات سے استفادہ کرتے ہوئے ان میں چند باتوں کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ جو چیزیں حسن کی ضامن بنتی ہیں فنون لطیفہ میں وہی جمالیاتی قدر قرار پاتی ہیں، جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ فن لطیف کے بعض تخلیقی نمونے المیوں سے عبارت ہوتے ہیں اور بعض میں نشاطیہ طرب انگیزیوں کی آنچ تیز ہوتی ہے اور حسن کے یہ دونوں ہی پہلو متعلقہ تخلیقی فن پاروں کی اساسی جمالیاتی قدر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس نہج سے جمالیات تخلیقی فن کاری کی بنیادی قدر ہے، اس کے بغیر فنون لطیفہ کا تصور ممکن ہی نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ادب میں اس قدر کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے کچھ ڈکشن ہوتے ہیں جو فن پاروں کے لطیف حسیاتی عناصر کی شناخت کے ضامن بنتے ہیں۔ اگر شیکسپیئر کے ڈراموں میں جمالیاتی قدروں کی نشاندہی المیوں کے توسط سے کی جاتی ہے تو اس کی وجہ ان ڈراموں کا المیاتی حسن ہے۔ یعنی المیہ نگاری ہی شیکسپیئر کے ڈراموں کا بنیادی وصف ہے۔ اسی ضمن میں غالبؔ کا ایک شعر اس وقت یاد آرہا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

''ننگ وجود'' کی ترکیب نے شعر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس میں المیاتی حسن کا رنگ چوکھا ہے جو اس کی جمالیاتی قدر کو بڑے ہی دلکش انداز میں ابھارتا ہے۔ اس شعر کا حسن اور اس کی دلکشی اس کے المیہ میں ہی مضمر ہے۔

اس گفتگو کو یہیں پر ختم کرتا ہوں اور موضوع کے پیش نظر

PDF Compressor Free Version

مذہب کی روشنی میں تصوف کی جمالیاتی کے سلسلے میں چند باتیں سنتے چلئے:

یہ بات طے ہے کہ تصوف مذہب کا حسن ہے۔ یعنی اس کے وسیلے سے مذہب کا ایک Cosmopolitan تصور فروغ پاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نظریہ بعض حلقوں کے لئے قابل قبول نہ ہو کیونکہ مذہبی عقائد و نظریات کی تبلیغ واشاعت اور ان کی تفسیر وتعبیر کے لئے علما کے نزدیک شریعت سب سے معتبر ترین میزان ہے۔ میرا اشارہ اسلامی شریعت کی جانب ہے اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ اس پر میرا یقین واعتماد ہے، لہٰذا میں اس متنازعہ فیہ مسئلے کے کانٹوں میں الجھ کر اپنے یقین واعتماد کو تارتار کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب تصوف باضابطہ ایک علاحدہ Faculty کی صورت میں تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر علم و فن کے اس اہم شعبے کے تعلق سے گفتگو کے تمام تر مضمرات واثرات ایک آزادانہ فکری رویے کے حامل ہوں گے جن میں معقولیت پسندی اور ایک مثبت توجیہ پسندی کی ذہنی روش کا عمل دخل بہرصورت ہوگا۔ چنانچہ تصوف کے موضوع پر گفتگو تو مذہب کے حوالے ہی سے ہوتی ہے، لیکن اس فیکلٹی سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کا جو گروہ ہے وہ مذہب کی ہمہ گیریت اور دیگر مذاہب کی بہترین قدروں کے ساتھ اس کے اشتراک عمل پر زور دیتا ہے۔ شکیل الرحمٰن کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے جو تصوف کے حوالے سے مذہب کی روشن اور آفاقی قدروں کی تلاش و جستجو میں ہر وقت سرگرداں نظر آتے ہیں۔ راقم الحروف کے نام اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

> ''تصوف تمام مذاہب کی روح ہے۔ کسی ایک مذہب کی روح نہیں۔ بدھ، عیسیٰ سب صوفی تھے۔ رسول کریمؐ اسلام کے سب سے بڑے صوفی ہیں۔ ان کے تصوف میں اسلام کی روح ہے۔ تمام مذاہب کی روح ہے۔''

اس اقتباس کی روشنی میں حضور سرور کائنات کی اس تعلیم کو یاد کیجئے جس میں پڑوسی کے ساتھ عزت واحترام کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اہل ایمان اور اغیار کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ اس میں بنی نوع انسانی کی عظمتوں کے اعتراف واقرار کا اعلیٰ ترین درس ہے۔ یہی وہ درس ہے جس میں تصوف کی روح پوشیدہ ہے اور اسی کو مفکرین اور دانشور حضرات تصوف کی جمالیات یا اس کے حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ہمہ گیر اور آفاقی متصوفانہ فکر ونظر میں Free Will کا وہ فلسفہ کارفرما ہے جس کے تحت جبر سے گریز اور رضا کارانہ مثبت طرز فکر ہی ایک صحت مند اور صالح معاشرے کی تعمیر کا سبب بن سکتی ہے، لہٰذا تصوف کے اس فکری مطمح نظر کی روشنی میں شکیل صاحب نے جو گفتگو اس کتاب میں کی ہے وہ حد درجہ فکر انگیز ہے۔

''جمال قلندری'' زیر بحث کتاب کا سب سے پہلا مضمون ہے اور میرا خیال ہے کہ تصوف کی جمالیات کی تشریح وتوضیح کے سلسلے میں اس کی حیثیت کلیدی ہے۔ مضمون کے بین السطور میں جمال تصوف کے پس منظر میں بیان کردہ نادر نکات سے شکیل صاحب کے صوفیانہ ذہن کو سمجھنے میں مدد تو ملتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ موضوع کے پیش نظر تقاضائے سخن کے اظہار میں ان کی غیر معمولی مہارت کا شدید احساس بھی ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ ''تصوف کی جمالیات'' کی صورت میں سمجھانے کی کتنی خوبصورت اور بلیغ کوشش کی گئی ہے:

> ''ہر صوفی میں قلندری موجود ہوتی ہے۔''

گویا ایک سچے صوفی کے ذہنی مزاج کی تشکیل قلندری اور فقر واستغنا جیسی خصوصیات سے ہی ہوتی ہے۔ اس کے باطن کے احوال خارجی علائق سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ یہ علم تصوف کا پہلا اور بنیادی درس ہے جس سے روگردانی ممکن نہیں۔ صوفی کی زندگی بے نیازانہ فکری سرگرمیوں کی مرہون ہوتی ہے۔

یہ وہی بے نیازی ہے جو اس کو بے جا مادی انسلاکات سے دور رکھتی ہے اور باطن کے نور اور تحرک کے وسیلے سے فکر ونظر کی ایک روح پرور دنیا آباد کرتی ہے۔ کتنے خوبصورت اور دلکش حسی پیکر ہیں یہ جو جمال تصوف کی وجد آفریں کیفیتوں سے روشناس کراتے ہیں۔ ان وجد آفریں کیفیتوں کے کینوس پر جمال تصوف کا ایک بنیادی رنگ بے نیازی نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس کی شان ہے قلندری۔ شکیل الرحمٰن نے تصوف کی اس بنیادی جمالیاتی قدر کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے کئی پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔

''قلندر اور قلندری' جمال تصوف کی یہ دو بنیادی علامتیں

PDF Compressor Free Version

شکیل صاحب کے نزدیک بے حد اہم، جاندار اور متحرک ہیں۔ چنانچہ ایک صوفی قلندر کی کیا پہچان ہے اور اس کے اندر قلندری کی صفات کیوں کر پیدا ہوتی ہیں، مضمون کی ابتدا میں اس جانب روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) ''قلندر آزادی کا پیکر ہے۔ اپنے وجود کو سمیٹے اللہ کے جلال و جمال سے رشتہ قائم کر کے دیوانہ بن جاتا ہے۔''

(۲) ''قلندری صوفیت کا منتہا بھی ہے اور اپنی علاحدہ شناخت بھی رکھتی ہے۔''

صوفی عالم جذب و کیف کی انتہائی منزل پر پہنچتا ہے تو اس کا وجود غرقِ الٰہی کے جمال آفریں نور کی بارش سے بھیگ کر شرابور ہو جاتا ہے۔ بارش کے قطروں سے باطن کی بجی کھچی کثافتیں بھی دھلتی جاتی ہیں اور سارا وجود تازگی، طمانیت اور شگفتگی کی الوہی کیفیتوں سے سرشار ہو جاتا ہے اور جب خالق کے جلال و جمال کا عرفان نصیب ہو جاتا ہے تو اس پر ایک قسم کی دیوانگی چھا جاتی ہے یعنی وہ خالق کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ یہی صوفیت کا منتہا ہے جو قلندر اور قلندری کا سبب بنتا ہے۔ قلندر، قلندری کا لبادہ اوڑھے جمالِ تصوف کے خمار آگیں جام سے تشنگانِ حق و معرفت کی تشنگی بجھاتا ہے۔ تصوف میں تحیر کے جمال کی دلکش فضا اسی راستے سے خلق ہوتی ہے، جس کے محسوسات کی دنیا میں عجیب و غریب اور نامعلوم سی ہمہ گیر انسانی قدروں کی خوشبوئیں رچی بسی ہوتی ہیں۔ ان انجانی اور نامعلوم خوشبوؤں کا بھید تو وہی جانے جس کے من کی دنیا میں حق و معرفت کے ادراک و آگہی کے لئے ہلچل مچی ہو۔ یہ قلندر ہے جو اپنے قلندرانہ مزاج کے دامن میں ان انجانی خوشبوؤں کو سمیٹتا چلا جاتا ہے، علم و آگہی کی سطح پر ان کا ادراک و عرفان حاصل کرتا ہے اور پھر راہِ طلب میں بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ یہ کیسا روحانی جمال آفریں قلندرانہ عمل ہے کہ تشنگانِ حق کی خوشنودی ہی اس کی قلندرانہ خوش نصیبی ہے۔

لہٰذا فریدالدین عطار کے حوالے سے شکیل صاحب نے الحلاج ابن منصور کو دنیا کے سب سے بڑے قلندر کی صورت میں اگر پہچانا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ الحلاج بن منصور کے ہاں جمالِ قلندری سلائم ہو جاتا ہے جب وہ کہتا ہے ''انا الحق'' (میں ہی تخلیقی سچائی ہوں۔) گزشتہ سطور میں شکیل الرحمٰن کی تحریروں میں جمالیاتی تجربے کے سلائم ہو جانے کی جو گفتگو کی گئی ہے اس کا اطلاق فکر و تصور کے اسی نہج پر ہوتا ہے۔ منصور کا ''انا الحق'' تصوف کی معراج بھی ہے اور جمالِ قلندری کا منتہا بھی۔ اتنا ہی نہیں عرفان و آگہی کی یہ منزل تصوف کی دنیا میں Sublimity کا اوجِ کمال ہے۔ یعنی "Raised above the ordinary level" عامیانہ پن کی سطح سے اوپر اٹھنے کے اسی روحانی عمل میں تصوف کی جمالیات کا راز پوشیدہ ہے۔

قلندر اور قلندری کے حوالے سے کی گئی گفتگو کے اب ایک دوسرے پہلو کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ پہلو ہے قلندروں کی پراسراریت جو تصوف کی جمالیات کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔ شکیل صاحب نے اس جانب تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) ''قلندر 'ملامتی' کہے گئے۔ یعنی تقصیروار، گنہگار، قلندروں کا ایک فرقہ بن گیا جسے ملامتیہ کہا گیا ہے۔''

(۲) ''ملامتیہ وہ درویش اور فقرا ہیں جو پوشیدہ عبادت کرتے رہتے ہیں۔ اپنا ظاہر ایسا رکھتے ہیں کہ دیکھنے والا انہیں دیکھتے ہی دور ہٹ جائے۔ لوگ انہیں برا کہیں تو اچھا لگتا ہے۔''

(۳) ''یہ پسند نہ تھا کہ وہ عشقِ الٰہی کی راہ کی رکاوٹوں اور اذیتوں کو کسی بھی سطح پر ظاہر کریں۔''

(۴) ''اسرار اور پوشیدہ دنیا..... آزادی اور بلند پروازی قلندری جمالیات کی بنیادی خصوصیات ہیں۔''

اندازہ ہوا ہوگا کہ قلندروں کے فکر و عمل کے حوالے سے جمالِ تصوف کے جن نکات کی تشریح و توضیح شکیل الرحمٰن نے کی ہے ان سے حد درجہ کسرِ نفسی، انکساری، بوریا نشینی اور ظاہری نام و نمود سے عدم دلچسپی کے دینی رویے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ متصوفانہ سرگرمیوں کے لئے ان اوصاف کی بنیادی حیثیت ہے جو سخت مجاہدے اور تزکیۂ نفس کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔

صوفیوں اور قلندروں کا یہ مجاہدانہ طرزِ فکر ان کے جذبۂ عشقِ الٰہی کا مظہر ہے۔ یہ منزل وہ ہے جہاں بڑے بڑوں کا وجود جھلس کر رہ

PDF Compressor Free Version

جاتا ہے اور جو اس جھلسے ہوئے وجود کی از سرِ نو آبیاری کر لیتا ہے وہی جمالِ قلندری کی کیف آور لذتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض دانشور حضرات قلندروں کی اس پر اسراریت کو Escapeism پر محمول کریں، کیونکہ ان کی پوشیدہ عبادتیں مروجہ اور متعینہ اصول وضوابط سے انحراف کرتی نظر آتی ہیں جو ظاہر ہے کہ قبول عام کا درجہ حاصل نہیں کر سکتیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ صوفیوں اور قلندروں نے مذہب کی بنیادی قدروں سے انحراف نہیں کیا بلکہ ان اقدار کو ایک سیال فکری صورت حال عطا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ سیل فکر کی اس نمو پذیری کے لئے ہی مذہب کے بنیادی حسن تصوف کی جانب توجہ دی گئی کہ اسی میں صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔ یہی صوفیوں کی متصوفانہ سرگرمیوں کا مقصود منتہا ہے جس کی انتہائی منزل قلندری ہے اور اسی راستے سے تصوف کی جمالیات کے معنی ومفاہیم بھی وضع ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان سارے متصوفانہ افکار ونظریات کا تعلق مذہب کی ان جمالیاتی قدروں سے ہے جو جمال تصوف کے شناخت نامے کو مرتب کرنے میں ہمہ وقت متحرک رہتی ہیں۔

زیر بحث کتاب کا دوسرا مضمون ہے ''ہندوستان کے علاقائی ادب میں تصوف کا جمال'' اس مضمون سے یہاں صرف دو اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں:

(۱) ''ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تصوف اور اس کی جمالیات کے چراغ روشن ہوئے۔ اسلامی تصوف نے بدھ، جین اور ہندو مابعد الطبیعات کے اثرات بھی قبول کئے۔''

(۲) ''جو صوفی بزرگ روحانی تجربوں کی ایک دنیا لے آئے وہ اس ملک کے مابعد الطبیعات تجربوں سے بھی متاثر ہوئے۔ کبیر، سورداس اور گرونانک بنیادی طور پر ان ہی تجربوں کے فنکار تھے جو صوفیوں کا سرمایہ تھے۔''

وسط ایشیا اور خصوصاً ایران سے آئے ہوئے صوفی ان سے متاثر ہوئے، اس حد تک کہ سورداس کا کلام سماع کی محفلوں میں پڑھنے لگے۔ ان دو اقتباسات سے فکر ونظر کی سطح پر دو معنی خیز نتائج اخذ ہوتے ہیں:

(۱) تصوف سے حد درجہ محبت

(۲) مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کے درمیان فکری اور نظریاتی ربط و تعاون نیز جذبہ خیر سگالی کو فروغ دینے کا درس

آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ تصوف سے محبت اور نظریات کی سطح پر اس کے ساتھ ساتھ اشتراک، ان دونوں میں زندگی بسر کرنے کا کیسا حسن ہے، کتنی دلکشی ہے۔ صحت مند معاشرے کی تشکیل وتعمیر کی زبردست تڑپ اور خواہش کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی ہے جمالِ تصوف اور اسی کے آئینے میں ہم آج بھی زندگی کی الجھی ہوئی زلفوں کو آراستہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ سورداس کے کلام کو سماع کی محفلوں میں پڑھا جانا، کبیر اور گرونانک کا صوفیت کے روحانی تجربوں سے متاثر ہونا اور اسلامی تصوف کا بدھ، جین اور ہندو مابعد الطبیعات کے اثرات قبول کرنا مذہب کے اسی Cosmopolitan تصور کو فروغ دینے کی ایک کوشش تھی جس کا تذکرہ گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔

مذکورہ کتاب کے آخری دو مضامین غالبؔ اور اقبالؔ کے حوالے سے ہیں جن کے عنوان ہیں (۱) مرزا غالبؔ اور تصوف کی جمالیات اور (۲) محمد اقبالؔ اور تصوف کی جمالیات۔

غالبؔ کے حوالے سے شکیل صاحب نے جو گفتگو کی ہے اس سلسلے میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

شکیل صاحب نے غالبؔ کی شاعری کے ایک پہلو جمال تصوف پر بڑے ہی بلیغ اور عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلم کار شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی جودت طبع میں کتنی زبردست گہرائی ہے۔

(۱) ''غالبؔ نے وحدت الوجود کے تصور کو خوب کھنگالا اور چلو بھر بھر کر اس کا رس پیا۔ مست مست ہو گئے، لیکن دانشوری کی سطح پر حد درجہ بیدار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلام غالبؔ کی جمالیات سے بڑی گہرائی اور کشادگی پیدا ہوئی اور اس کی سطح بھی بلند ہو گئی۔''

(۲) ''مرزا غالبؔ کی سائیکی (Psyche) میں جس صوفی

PDF Compressor Free Version

کا ذہن موجود ہے وہ 'عشق' کو بے پناہ اہمیت دیتے ہوئے شعری تجربوں میں چراغاں کی کیفیت پیدا کرتا رہتا ہے۔ 'جنوں' کے بغیر عشق کا تصور پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ 'جنوں' کے بغیر صوفی یا قلندر کا تصور ذہن میں ابھرتا ہی نہیں۔ عشق اور جنوں غزل کی روح ہے۔ تصوف کی رومانیت اور اس کی جمالیات سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔''

غالبؔ کی شاعری میں شکیل صاحب نے تصوف کے حسن کے دو نمایاں پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ایک تو فلسفہ وحدت اور الوجود ہے، غالبؔ کی ذہنی وفکری دلچسپی جس کے وسیلے سے اس کی شاعری کا ایک دھارا فکر وفلسفہ کی وہ صورت ہے جس میں وجودی نظریے کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس سلسلے میں عرض یہ کرنا ہے کہ تصوف کے وجودی نظریے کے فروغ کا مرکز ومحور ہندوستان ہی رہا ہے۔ جیسا کہ مولانا آزاد نے 'غبار خاطر' کے مکتوب نمبر ۱۳ میں لکھا ہے:

''دنیا میں وحدت الوجود (Pantheism) کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے' گویا اس نظریے میں ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی روح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اپنی شاعری میں وجودی فلسفے کو جگہ دی تو کیوں؟ کیا غالبؔ عملی طور پر صوفی تھے؟ ظاہر ہے کہ غالبؔ کی زندگی متصوفانہ سرگرمیوں سے عبارت نہیں تھی، بلکہ غالبؔ نے اس فلسفے کو نظریہ کی سطح پر اس لئے قبول کیا کہ ان کے تخلیقی ذہن کی نشو ونما ہند آریائی کلچر کے زیر اثر ہوئی۔ یہ کلچر غالبؔ کو اردو زبان کے وسیلے سے ملا جس کا لسانی آمیزہ ہند آریائی اور ترک تہذیبوں کے امتزاج سے تیار ہوا تھا، لہٰذا تخلیقی سطح پر غالبؔ کی شاعری کا ایک نمایاں حسن تہذیبوں کے مابین اشتراک ہے۔ یہی وہ اشتراک ہے جو تصوف کی صورت میں ان کی شاعری میں اُجاگر ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غالبؔ کا مکمل شعری سرمایہ اس تخلیقی رویے کا مرہون ہے، ہاں البتہ ان کے کلام کا ایک اچھا خاصا حصہ تصوف کے اس فکری سرمائے سے ضرور بھرا پڑا ہے جو ان کی شاعری میں حسن کے ایک نمایاں پہلو کی صورت میں نظر آتا ہے۔ شکیل صاحب نے اس ضمن میں جو اشعار پیش کیے ہیں ان کی تخلیقی نوعیت نشاطیہ اور المیہ دونوں ہی ہے۔ تخلیقی حسن کاری کی ان دونوں ہی صورتوں کے توسط سے جمال تصوف کی فکری ترسیل فن کی سطح پر نہایت ہی کامیابی کے ساتھ ہوتی ہے۔ غالبؔ کی یہ غزل مجھے حد درجہ دلکش نظر آتی ہے جس میں تخلیقی فنکاری کا حسن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ساتھ ہی صوفیت کی سطح پر فن کار کا تخلیقی ذہن رقص کرتا نظر آتا ہے۔ شکیل صاحب نے بھی اپنے موقف کے ثبوت میں اس غزل کو پیش کیا ہے ۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے

غزل کے یہ اشعار جو بہ رنگ نشاطیہ ہیں، جمال تصوف کے حسین شاہکار ہیں۔ اس میں وجودی نظریہ بھی ہے، لیکن چونکہ یہ ایک سیال تخلیقی تجربہ کی صورت میں احساس کی زیریں لہروں میں نمو پذیر ہوا ہے، اس لئے فلسفیانہ بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ بقول شکیل الرحمٰن:

''بنیادی صوفیانہ تجربوں میں بھی ان کے 'شوق' نے تازگی اور نئی حرارت بھر دی ہے۔''

''شوق'' کے جس استعارے کو شکیل الرحمٰن نے تصوف کی جمالیات کی تشریح وتوضیح کے لئے استعمال کیا ہے اسی راستے سے عشق اور جنوں کی کیفیت بھی تصوف کی سطح پر پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ غالبؔ کی شاعری میں عشق میں حد درجہ جنون انگیزی متصوفانہ فکری سرگرمیوں کو جلا بخشتی ہے۔ شکیل صاحب کے نزدیک عشق اور جنوں جمال تصوف کی دو بنیادی اور جاندار علامتیں ہیں۔ تصوف کی سطح پر اس شعری عمل میں جمالیات کی

(بقیہ ص ۵۰ پر)

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر مشتاق احمد

Principal Marwari College, Darbhanga (Mob. 9431414586)

مطالعہ جمالیات اور پروفیسر شکیل الرحمٰن

اردو میں بین علومی مطالعے کو استحکام بخشنے والوں میں پروفیسر شکیل الرحمان اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف مشرقی و مغربی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا بلکہ ہندوستانی صنمیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہیں سنسکرت زبان پر عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی جمالیات اور بالخصوص اساطیر کی جمالیات کو مستقل طور پر ایک ''اسکول آف تھاٹس'' کا مقام عطا کیا۔ ہندوستانی جمالیات کے تعلق سے ان کی تین درجن سے زائد کتابیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ انہوں نے جہان فنون لطیفہ کو وسعت دینے میں کس قدر اپنا خون جگر صرف کیا تھا۔ پروفیسر شکیل الرحمان نے اپنی کتاب ''ادبی قدریں اور نفسیات'' ۱۹۶۵ء میں یہ تصور پیش کیا تھا کہ:

> ''اساطیر کا مطالعہ توہم پرستی، زندگی کے المیے کے گہرے اثرات اور موت کے پراسرار خوف کے جذبے کا بھی مطالعہ ہے، ساتھ ہی متحرک علامات، عقائد، داخلی کیفیات اور نفسیاتی کشمکش اور تصادم، فریب اور واہمہ خواہشات کی تکمیل سے محرومی اور شکست کی آواز کا بھی مطالعہ ہے۔''

ان کے ان خیالات کی روشنی میں جب ہم ان کی دیگر کتابوں بالخصوص ہندوستانی جمالیاتی مطالعے سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ پروفیسر شکیل الرحمان کی سائیکی میں اساطیری کردار ایک چراغ نو کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا واضح اعتراف بھی انہوں نے کیا:

> ''اساطیری کردار اور واقعات انسان کی سائیکی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے انسان کے ابتدائی تخلیقی ذہن اور اس کی جمالیاتی کیفیات کو بہت حد تک سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ تماثیل اور تاریخ کی بنیاد اساطیری قصے ہیں، اساطیری رموز و اسرار کی پھیلی ہوئی داستان ہے۔'' (اساطیر کی جمالیات، ص۹)

اتنا ہی نہیں پروفیسر شکیل الرحمان کی نگاہ میں اساطیر فنون لطیفہ کی سب سے قدیم پراسرار متحرک روایت ہے۔ دراصل کرسٹوفر کاڈول نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "الیوژن اینڈ ریلٹی" (Illusion and Reality) میں اس بات کی وکالت کی تھی کہ انسان کے نسلی لاشعور میں اساطیر کی ایک دنیا آباد ہے۔ کاڈول کی کتاب میں ایک باب "دی ڈیتھ آف میتھولوجی" یعنی اساطیر کی موت کا اعلان تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ اساطیر حقیقت نہیں ہوتی، اس میں صرف فوق الفطری عناصر ہوتے ہیں، لیکن پروفیسر شکیل الرحمان نے اپنے اساطیری مطالعے میں اس بات کی وکالت کی ہے کہ اساطیر کا سفر انسانی ذہن کو ایک منزل مقصود تک پہنچانے میں معاون رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسطوری علامات کی کائنات کو وسیع تہہ دار اور جہت دار قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں:

> ''اساطیر میں تخیل اور جذباتی فکر میں زندگی اور سماج سے فنکارانہ گریز کی عمدہ تصویریں ملتی ہیں۔ حقیقت کی مختلف جہتیں ملتی ہیں، ایک خیال یا تصور پر کئی سمتوں سے روشنی پڑتی ہے۔ انسان کے تخیل کی شادابی کی کئی مثالیں ملتی ہیں، اساطیر کا کلاسکی مزاج فنون لطیفہ کو مختلف انداز سے متاثر کرتا رہا ہے۔'' (اساطیر کی جمالیات، ص۱۳)

غرض کہ انہوں نے نہ صرف جمالیاتی تنقید اور ہندوستانی جمالیات کے مطالعے کو وسعت بخشی بلکہ اردو تنقید کے شجر کو بھی تناوری بخشی ہے۔ انہوں نے ایک خاص تنقیدی اسکول ''جمالیات'' کو اعتبار کا درجہ بخشا۔

PDF Compressor Free Version

سچائی تو یہ ہے کہ حالیہ صدی میں جمالیاتی تنقید اور پروفیسر شکیل الرحمٰن کا نام لازم وملزوم بن گیا تھا اور کیوں کر نہ ہوتا کہ ان کے افکار ونظریات کا محور ومرکز ''مطالعہ جمالیات'' ہی تھا اور اس شعبہ میں انہوں نے جو اپنے واضح نقوش ثبت کئے ہیں وہ ابدیت کے حامل ہیں۔ ان کی مطبوعہ تصانیف پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی مکمل زندگی کتابوں کے درمیان گزری ہے۔ وہ اردو کے ایک ادیب ونقاد ہی نہیں تھے بلکہ ایک تخلیقی فنکار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا اور ناول نویسی میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی تھی، مگر تنقید کی دنیا انہیں فکشن سے دور کرتی چلی گئی۔ بالخصوص مطالعہ جمالیات نے انہیں اپنے سحر میں کچھ اس طرح باندھے رکھا کہ دوسری دنیا کی طرف توجہ قدرے کم رہی، لیکن یہ اردو ادب کی خوش قسمتی تھی کہ پروفیسر شکیل الرحمان نے جمالیات کی دنیا کی سیر کو ہی اپنا مامن ومسکن بنایا۔ ذرا ان کی کتابوں کی فہرست کو دیکھئے، یقین نہیں آتا کہ اردو کا ایک استاد عرفان وآگہی کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑ جائے گا۔ ''اساطیر کی جمالیات''، ''مولانا رومی کی جمالیات''، ''جمالیات حافظ شیرازی''، ''کبیر کی جمالیات''، ''نظیر اکبر آبادی کی جمالیات''، ''تصوف کی جمالیات''، ''محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات''، ''کلاسکی مثنویوں کی جمالیات''، ''غالب کی جمالیات''، ''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات''، ''فراق کی جمالیات''، ''فیض احمد فیض کی جمالیات''، ''ہندوستانی جمالیات''، ''مجتبیٰ حسین کا فن''، ''جمالیاتی تناظر''، ''امیر خسرو کی جمالیات'' اور ''ہندوستان کا نظام جمال بدھ جمالیات سے جمالیات غالب تک'' (تین جلدیں) ''ہندوستانی جمالیات'' (تین جلدیں) ''قرآن حکیم جمالیات کا سرچشمہ'' وغیرہ۔ اس کے علاوہ ''غالب اور مغل مصوری''، ''غالب کا داستانی مزاج''، ''رقص بتان آذری''، ''منٹو شناسی''، ''فکشن کے فنکار پریم چند''، ''داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا''، ''اختر الایمان جمالیاتی لیجنڈ''، ''محمد اقبال''، ''ابوالکلام آزاد'' اور ''راگ راگنیوں کی تصویریں''، ان کی ایسی تصانیف ہیں کہ جن کے ذکر کے بغیر تاریخ ادب کا مکمل ہونا ناممکن ہے۔ ان کی خود نوشت ''آشرم'' اور ناول ''سمندر کا سفر'' کے ساتھ ساتھ سفر نامہ ''قصہ میرے سفر کا''، ''دیوار چین سے بت خانہ چین تک''، ''لندن کی آخری رات'' اور ''دربھنگے کا جو ذکر کیا'' اردو نثر پارے کے گنج ہائے گراں مایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کی مندرجہ بالا کتابوں کے مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ادب اور زندگی کے تئیں ان کا ایک واضح تصور تھا، وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے جس کا اعلانیہ ان کی پہلی کتاب ادب اور نفسیات میں واضح ہے۔ ''جدید شاعری کے نئے چراغ''، ''ادبی قدریں اور نفسیات''، ''اقبال روشنی کی جمالیات''، ''اقبال اور فنون لطیفہ'' اور ''دست فکر'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) میں بھی انہوں نے اپنے نظریہ زیست اور نظریہ ادب کی وضاحت کی ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی یہ ذکر آچکا ہے کہ پروفیسر شکیل الرحمان کے افکار ونظریات کا محور ومرکز جمالیات رہا ہے، بالخصوص اساطیر کی جمالیات ان کے لئے خاص مطالعہ کی چیز رہی ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> ''دراصل انیسویں صدی میں سائنسی ذہن نے پہلی بار ذہن انسانی کی تاریخ کے قوانین کا مطالعہ کیا اور اسطور کو ایک بڑا ذریعہ سمجھا۔ اس سے قبل ہی علمائے اساطیر نے مطالعے کی بنیاد مضبوط کردی تھی، اس بنیاد کے بغیر کسی سائنسی قدر کی پہچان مشکل تھی۔ اسطوری علامات کی کائنات وسیع تہہ دار اور جہت دار ہے۔ یہ علامات گہرائیوں سے آشنا کرتی ہیں اس طرح تخیل کی شادابی، زرخیزی اور بلندی کا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ اقدار کے تصادم اور ان کے تسلسل کے تعین میں بھی بیداری پیدا ہوتی ہے۔'' (اساطیر کی جمالیات، ص ۱۲)

پروفیسر شکیل الرحمان کی نگاہ میں امیر خسرو ہوں کہ کبیر، رومی ہوں کہ نظیر اکبر آبادی، غالب ہوں کہ اقبال، فراق ہوں کہ فیض، پریم چند ہوں کہ منٹو، سب کے سب جمالیاتی نقوش کے شاعر وفنکار ہیں، اس لئے وہ ان تمام فنکاروں کا مطالعہ جمالیات کی قوس وقزح کی روشنی میں کرتے ہیں۔ جب وہ کبیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ:

> ''کبیر جمالیات اور آرچ ٹائپ اور سائیکی کے تعلق سے

PDF Compressor Free Version

بیداری کے بہت بڑے شاعر ہیں۔''

اور جب نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ:

''ان کی جمالیات میں انسان، اس کی تمدنی اور تہذیبی زندگی، مناظر حسن و جمال، مظاہر کائنات، رقص حیات، محبتوں کے نغمے، قہقہے، مختلف قسم کی خوبصورت آوازوں کا آہنگ، سب شامل ہیں۔''

میر، غالب، اقبال اور فیض وفراق کے یہاں بھی انہیں صرف اور صرف جمالیات کی دنیا آباد نظر آتی ہے اور ان شعرا کے جمالیاتی تجربہ کو جہان ادب کے لئے سرمایہ عظیم قرار دیتے ہیں۔ اختر الایمان کی نظموں میں بھی انہیں پوری نسل انسانی سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ اس لئے کہ اختر الایمان کے لاشعور میں جمالیاتی عکس کارفرما ہے۔ وہ فیض احمد فیض کو دنیائے ادب کا ایک عظیم شاعر اس لئے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں:

''فیض کی شخصیت کا ارتقا اسی تہذیب میں ہوا ہے، ان کی شاعری اسی تہذیب کی جمالیات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہے۔ ان پہلوؤں اور جہتوں کو ہیومنزم کے جمالیاتی مظاہر سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ فیض کا اپنا منفرد رومانی، جمالیاتی شعور واحساس ہے جو اس عہد کی دین ہے۔'' (فیض احمد کی جمالیات، ص۱۰)

شکیل الرحمٰن کی نگاہ میں شاعری ہو کہ فکشن جہاں کہیں بھی جمالیاتی حس کی کارفرمائی نہیں ہوتی وہ شاعری یا نثر نگاری قاری کی دلکشی کا باعث نہیں ہوسکتی، اس لئے کسی بھی تخلیق کار کے لئے حسی طور پر بیدار ہونا ضروری ہے، اگر فنکار یا تخلیق کار فطرت کے اس عطیہ سے محروم ہے تو اس کے فن میں ابدیت نہیں آسکتی ہے۔ شکیل الرحمان منٹو کے افسانوں کے حوالے سے اس بنیادی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب پریم چند کا مطالعہ پیش کرتے ہیں تو پریم چند کی دھنیا اور مادھو، گھیسو کی تصویروں میں بھی انہیں جمالیات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ دراصل شکیل الرحمان زندگی کی جمالیات کی گہرائی اور گیرائی تک رسائی رکھتے ہیں، اس لئے وہ جب کسی بھی کردار کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو اس کردار کی زندگی کے اسرار ورموز میں جمالیات کو کارفرما دیکھتے ہیں۔

شکیل الرحمٰن ہندوستانی صنمیات کو ہندوستانی جمالیات کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں، اس لئے جب بھی وہ ہندوستانی جمالیات کے مسلمات پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہندو صنمیات کی باریکیوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ''نٹراج'' نہ صرف ایک مجسمہ سازی کا اچھوتا نمونہ ہے بلکہ اس کے نت، نرت اور نرتیہ تینوں جمالیاتی تجربوں کے عمدہ اظہار کے ذرائع ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمان جب ہندوستانی رقص پر گفتگو کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ رقص کے تمام اسرار ورموز سے وہ نہ صرف واقف ہیں بلکہ رقص کی تکنیک کے ماہر بھی ہیں۔ ان کی نگاہ میں:

''خالق کائنات نے رقص اور ڈرامے کی صورت میں عوام کو جو نعمت عطا کی تھی اس نے خود اس کی حفاظت بھی کی تھی تا کہ ان فنون کے ذریعہ زندگی اور کائنات کی سچائیوں کا احساس ہر وقت ملتا رہے۔ رقص کو ابتدا سے کتنا مقدس تصور کیا گیا ہے اور اسے تقدس کی کیسی اعلیٰ سطح عطا کی گئی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔''

(ہندوستانی جمالیات، ص۱۹۳)

مندرجہ بالا اقتباس کا مطالعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پروفیسر شکیل الرحمان نے کس گہرائی اور گیرائی سے ہندوستانی صنمیات کا مطالعہ کیا ہے اور ہندوستان کے مجسموں اور رقص میں اعلیٰ تخلیقی وجدان کی تلاش کی ہے۔ میرے محدود مطالعے کے مطابق اردو کے ناقدین میں یہ جستجو صرف اور صرف شکیل الرحمان کے یہاں دکھائی دیتی ہے کہ وہ ہندوستانی متھ یا اسطور کو انسان کے احساس وجذبے کا حصہ بنا دیتے ہیں اور اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''ہندوستان کے تخلیقی آرٹ نے ہر عہد میں اس پیکر کے کئی روپ دیکھے، اس کے جلال کو دیکھا، اس کے یوگ کے عمل کو اپنے وجدان اور اپنے ذہن میں جذب کیا۔ اس کے آزادانہ عمل کے تحرک کو محسوس کیا اور زبان کی سطح کو پہچاننے کی کوشش کی اور اس کے رقص کے آہنگ کو اپنے وجود کا آہنگ بنایا۔'' (ہندوستانی جمالیات، ج۳، ص۲۹۰)

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے دنیا کی مختلف تہذیبوں کے مطالعے کی روشنی میں

PDF Compressor Free Version

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی جمالیات اور ہندوستانی اساطیر نے ہمیں ایک مہذب قوم کا درجہ دلانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔انہوں نے چینی اساطیر، بدھ اساطیر، کنفیوشیشن ازم اور تاؤ ازم کے مقابلے ہندوستانی اساطیر کو شعور وآگہی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں اساطیر کے وسیلے سے ہی کوئی فنکار ماضی سے باطنی اور ذہنی رشتہ قائم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ماضی کی حسیت کی بدولت ہی فنکار جمالیات کی مختلف جہتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے،اس لئے جب پروفیسر شکیل الرحمان میراجی کی شاعری میں جمالیات تلاش کرتے ہیں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

''میراجی کی شاعری میں جو باطنی کیفیات ہیں اس سے ماضی کی حسیت کی زیادہ پہچان ہوتی ہے۔دھرتی ماں کے پیکر میں ابھرتی ہے،اساطیری کردار خصوصاً رادھا اور کرشن ہمیشہ قائم رہنے والے عشق کی علامت بن جاتے ہیں۔''

(اساطیر کی جمالیات،ص۱۹۲)

مختصر یہ کہ پروفیسر شکیل الرحمان نے مطالعہ جمالیات کو اپنے شعور ولاشعور کا حصہ بنالیا تھا،اس لئے وہ جدھر بھی نگاہ کرتے تھے ہر طرف انہیں جمالیات ہی جمالیات نظر آتا تھا۔مولانا رومی کی تصوفانہ زندگی ہو کہ منٹو کی نفسیاتی الجھن،اقبالؔ کا تصور عشق ہو کہ فیضؔ کا جہان رومان اور غالبؔ اور مغل جمالیات تو ان کے فکر ونظر کا محور ومرکز بن گیا تھا،حتیٰ کہ راگ راگنیوں کی تصویروں میں بھی انہیں ہندوستانی جمالیات کی ایک دنیا آباد نظر آتی تھی۔قلی قطب شاہ،امیر خسروؔ اور کبیر،نظیر اکبر آبادی اور میر تقی میرؔ کی شاعری ان کی نگاہ میں اس لئے عظیم شاعری کا درجہ رکھتی ہے کہ ان سب کے یہاں ہندوستانی جمالیات کے ارتعاشات موجود ہیں جو انسان کے وجود کو اپنی گرفت میں کر لیتے ہیں۔

پروفیسر شکیل الرحمان کی نظر میں جمالیاتی عکس کی بدولت ہی جہان فکر ونظر پر کشش بنی ہے اور ہندوستانی تخلیق کاروں وفنکاروں کا جمالیاتی شعور دیگر ممالک کے فنکاروں کے مقابلے قدرے بیدار رہا ہے۔ ان کی نگاہ میں جمالیاتی سروکار کے بغیر کسی مہذب سماج کی تشکیل ممکن نہیں اور سماج کے بغیر فنون لطیفہ کا وجود ناممکن ہے،اس لئے وہ ہر تخلیق میں جمالیاتی عکس کے خواہاں نظر آتے ہیں۔وہ صرف ادبی تخلیقات شعری یا نثری میں ہی نہیں بلکہ آرٹ،موسیقی اور رقص میں بھی جمالیاتی پرتو کے متلاشی نظر آتے ہیں:

''ہندوستانی جمالیاتی روایات کی پہچان تاریخ کے تسلسل میں ہوتی ہے۔تازہ اور نئے موضوعات کے پیش نظر بھی اور اظہار کی مختلف جمالیاتی صورتوں کے ساتھ بھی، کثرت کا حسن بھی ملتا ہے اور وحدت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔فطرت اور انسان،انسان اور دھرتی اور انسان اور انسان کے رشتوں نے ہندوستانی فنون کی جمالیات کو ایک تابناک موضوع بنا دیا ہے۔''

(ہندوستانی جمالیات،جلد اول،ص۱۳)

خلاصہ کلام یہ کہ پروفیسر شکیل الرحمان ہندوستانی تہذیب وتمدن کے دلدادہ ہیں،بالخصوص وہ ہندوستانی صنمیات کے رمز شناس ہیں اور اس معنی میں دنیائے اردو ادب میں کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہیں کہ جس نے سناتن دھرم کے متھ اور صنمیات کو ایک شعبۂ مطالعہ کی شکل دی ہو۔ان کی نگاہ میں:

''ہندوستانی تہذیب،انسان کی اعلیٰ ترین قدروں کا سرچشمہ ہے۔اس تہذیب نے ہر دور میں اعلیٰ اور انتہائی عمدہ صفات و اقدار کا شعور دیا ہے۔''(ہندوستانی جمالیات،ص۲۰)

❁❁❁

ضروری اطلاع

زبان و ادب کی خریداری کے لئے آپ زرسالانہ سو روپے براہ راست اردو اکادمی کے اکاؤنٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں،لیکن رقم بھیجنے کی جانکاری کے ساتھ ہی اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر اکادمی کو ضرور بھیج دیں۔

Bihar Urdu Academy

Bank of India, Chauhatta, Patna 800004

SB A/c No. 440810100006014

IFSC Code- BKID0004408

PDF Compressor Free Version

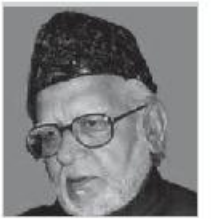

اسلم بدر

Jamshedpur (Mob. 09631476773)

بابا سائیں، کچھ تاثرات

اکیسویں صدی دروازۂ ماہ سال پر دستک دے چکی تھی۔ ''مثنوی کن فیکون'' کا مسودہ تیار تھا، خواہش تھی کہ کوئی بڑا نام اسے ایک نظر دیکھ لے اور مناسب سمجھے تو اپنی رائے بھی لکھ بھیجے تاکہ کتاب کی زینت بڑھالی جائے، مگر وہ بڑا نام کون ہوسکتا ہے؟ اندرون نے سرگوشی سی کی..... پروفیسر شکیل الرحمٰن۔ دل نے کہا تائید، دماغ نے فیصلہ سنا دیا، مگر کچھ تامل سا رہا کہ بغیر سفارش، اس عظیم شخصیت تک پہنچا کیسے جائے۔ مسودہ بھیج بھی دیا جائے تو کیا ضروری ہے کہ وہ اسے گھاس بھی ڈالیں۔ جان پہچان کی تو بات ہی کیا کیجئے، میں نے تو اب تک انہیں دور دور سے بھی دیکھا تک نہیں ہے۔ ہاں! میرے پاس ان کی دو تصویریں ضرور ہیں۔ ایک عین جوانی کی، جب وہ شکیل الرحمٰن تھے اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہے تھے۔ دوسری تصویر ''بابا سائیں'' کی جو انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے اور ان کی بعض کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

پہلی تصویر میں وہ اسم بامسمیٰ نظر آئے۔ گورا چٹا گول کتابی چہرہ، روشن و کشادہ پیشانی، کشادہ اس لئے بھی کہ سر کے اچھے خاصے حصے پر قابض تھی۔ ڈوبتی ابھرتی ہوئی آنکھیں، جیسے خواب سے ابھی ابھی بیدار ہوئی ہوں، درمیانہ قد، بڑا سا سر جس کے دو تہائی حصے کو ڈھانپے ہوئے بچے سنورے بھرے بھرے سیاہ بال۔ یہ تصویر رانچی میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک کنونشن کی ہے، جس میں موصوف نے اختر پیامی، انور عظیم، کلام حیدری اور منظر شہاب کے ساتھ شرکت کی تھی۔ دوسری تصویر میں بھی آپ اسم با مسمیٰ ہی ہیں، چہرے پر وہی چمک ہے، آنکھیں ویسی ہی خمار آلودہ ہیں، مگر پیشانی کچھ اور کشادہ ہوگئی ہے، وہ اس لئے کہ زلفوں نے اپنی سرحد چھوڑ کر دفاعی مورچہ بنالیا ہے۔

اب جو مسودہ ہاتھ میں تھا تو منظر شہاب کی یاد آگئی۔ یاد آیا کہ رانچی کے کنونشن میں شہاب صاحب بھی موجود تھے۔ بھاگتا ہوا منظر شہاب صاحب کے دولت کدے پر اس غرض سے پہنچا کہ ان کی سفارش کام آسکتی ہے۔ شہاب صاحب نے بھی مسودے کو تولتے ہوئے یہی رائے دی کہ اس پر تو شکیل الرحمٰن کا ہی مضمون ہونا چاہئے، مگر..... مگر وہ مضمون نہیں لکھیں گے..... ''نہیں لکھیں گے۔'' سن کر امید زخم زخم ہوگئی، وجہ پوچھی تو کہنے لگے:

''پٹنہ یونیورسٹی میں ہم پانچ (اختر پیامی، انور عظیم، کلام حیدری، منظر شہاب، شکیل الرحمٰن) ایک تھے۔ صوبہ بہار میں ترقی پسند ادب کے سرگرم کارکن بھی تھے، سپاہی بھی اور سالار بھی۔ ہماری اکثر شامیں ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد معاش کی تلاش نے ہمیں پانچ الگ الگ خانوں میں تقسیم کردیا۔ میں نے جمشید پور آکر کوآپریٹو کالج جوائن کرلیا، مگر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں شکیل مجھ سے ایک سال جونیئر تھا، مگر میرا یار تھا، یا یوں کہئے کہ میں اسے اپنا یار سمجھتا تھا۔ اپنے پہلے شعری مجموعہ پیراہن جاں پر اسی سے مضمون لکھوانا چاہا تھا مگر کئی بار یاد دہانی کے بعد بھی ناکامی ہاتھ آئی۔ وعدہ کیا ضرور، مگر وہ وعدہ، وعدۂ محبوب ہی رہا۔''

اتنا سننے کے بعد، سوچا کہ اب شہاب صاحب سے سفارش کی درخواست کرنا بے وقوفی ہوگی۔ مسودہ در بغل، سر جھکائے گھر واپس ہوگیا۔ کچھ دن اور گزر گئے، بڑے مایوس مایوس سے، تھکے تھکے سے۔ ایسے ہی تھکے تھکائے لمحوں میں، میں کبھی کبھی اپنے اندر جھانک لیتا ہوں، جہاں ارادے اور حوصلے کے پرچم کو ہمیشہ سربلند پاتا ہوں، آج بھی وہ پرچم سرنگوں نہیں تھا۔ سوارادہ کرلیا، بغیر کسی سفارش کے 'کن فیکون'' کے مسودہ کو وہاں تک پہنچاؤں گا۔ ایک ننھے منے سے خط کے ساتھ مسودہ

PDF Compressor Free Version

شکیل الرحمٰن صاحب کے ''آشرم'' تک پہنچ گیا۔

انتظار کی گھڑیاں گن ہی رہا تھا کہ ایک شام پروفیسر منظر حسین (آج کے صدر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی) غریب خانے پر تشریف لائے۔ اکثر آتے رہتے تھے کہ میری بیگم (نزہت پروین) ان کی رہنمائی میں اپنا تھیسس مکمل کر رہی تھیں۔ انہیں جب حالات کا علم ہوا تو موبائیل کے بٹن دبانے شروع کردئے۔ اسلم بھائی! ان دنوں یہ سب کام بغیر سفارش ممکن نہیں، مزید یہ کہ شکیل صاحب سے ان کے اچھے مراسم ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ آشرم سے رابطہ قائم ہوگیا۔ منظر حسین صاحب نے دو چار منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کیں، کچھ میرے اور مثنوی ''کن فیکون'' کے بارے میں بتایا اور تب اچانک موبائیل میری طرف بڑھادیا:

''لیجئے بات کر لیجئے۔'' گھبراہٹ میں پسینے چھوٹنے لگے۔ کیا بات کروں، کیسے بات کروں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں نے شکیل صاحب سے گھبرائے گھبرائے لہجے میں اتنا ہی عرض کیا:

''نہایت ہی پست قد شاعر ہوں، گوشہ نشینی پسند ہے۔ ادب سے نکال باہر کی ہوئی ایک صنف (مثنوی) کو گلے لگایا ہے۔ ایک شعر بھی پسند آجائے تو تبرک کے طور پر کچھ جملے لکھ بھیجئے گا، میری کتاب کا وقار بڑھ جائے گا۔ کچھ بھی پسند نہ آئے تو مسودے کو وہیں پھاڑ کر پھینک دیجئے گا۔ میں سمجھ لوں گا کہ واقعی اس صنف کو راندۂ درگاہِ ادب کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف شکیل صاحب بڑی خاموشی سے مجھے سنتے اور بھانپتے رہے اور پھر میرے کانوں میں نرم گرم شہد کی دھاریاں اترنے لگیں:

''اسلم بدر صاحب! میں نے آپ کی مثنوی لفظ لفظ پڑھ لی ہے، آپ کو جلدی تھی اس لئے ایک مختصر سا مضمون بھی تیار کر لیا ہے۔ کل پرسوں تک بھیج دوں گا۔''

دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ہوش وگوش کے سارے دروازے بند ہوگئے۔ اس کے بعد کیا باتیں ہوئیں،، مجھے یاد نہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بدن روئی کے گالے کی طرح ہلکا ہوکر زمین اور آسمان کے بیچ معلق ہوگیا ہے۔

یہ وعدہ، وعدۂ محبوب ثابت نہیں ہوا، ایک ہفتے کے اندر ہی کوریر سے مسودہ اور مسودے کی پیشانی پر ہی لکھا ہوا شکیل الرحمٰن صاحب کا ایک خط اور مسودے سے نتھی کیا ہوا مضمون مل گیا۔ بڑی بے تابی تھی۔ جلدی جلدی ان کے خط اور مضمون کو پڑھا، دو تین بار پڑھا۔ ایسا لگا جیسے کسی قلندر نے اپنی گدڑی سے کچھ لعل وجواہر نکالے ہیں اور پہلو بچا کر نکلتے ہوئے کسی انجان راہگیر کی طرف اچھال دئے ہیں۔ اس کے بعد تو وہ قلندر جیسے ہمارے گھر کا ایک فرد ہوگیا۔ خطوط اور ٹیلیفون کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اسی دوران معلوم ہوا کہ شکیل صاحب ''بابا سائیں'' بھی ہیں اور ان کی بیگم ''اماں سائیں''۔ ہماری بیگم اور بچے بھی ''بابا سائیں'' اور ''اماں سائیں'' سے مانوس ہوگئے۔

اپنے ادبی تجربے میں تنی ہوئی گردنیں تو بہت دیکھی ہیں، پہلی بار اندازہ ہوا کہ ہماری ادبی دنیا بھی کچھ بڑے لوگ واقعی بڑے ہوتے ہیں، کسی پھلدار شاخ کی طرح جھکے ہوئے۔ محسوس ہی نہیں ہونے دیتے کہ وہ کسی کمتر و کہتر و مہتر سے باتیں کر رہے ہیں۔ آج میرے پاس ان کی کئی تصویریں ہیں، ان کی آواز کی تصویریں۔ جب بھی ان سے فون پر بات ہوتی ہے، ان کی ٹھہری ٹھہری مشفقانہ گفتگو میرے تخیل کے کینوس پر تصویریں بناتی رہتی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خطوط کے روشن حروف کی دھنک سے بھی ان کی تصویر اترتی رہتی ہے۔ ان کے یہ خطوط آج میرا ادبی سرمایہ ہیں۔ لوگ باگ تو نہ جانے کس کس کے کیسے کیسے خطوط کا مجموعہ شائع کرواتے رہتے ہیں، کتابیں مرتب ہوتی رہتی ہیں۔ میرے پاس بابا سائیں کے خطوط میرے اپنے ہیں، صرف میرے لئے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان خطوط کو ع

نسیم صبح بھی چھو لے تو رنگ میلا ہو

مثنوی جب شائع ہوگئی تو پہلا نسخہ میں نے شکیل صاحب کو ارسال کیا۔ کتاب ملتے ہی ان کا فون آیا، بہت دیر تک مثنوی کے متن پر گفتگو ہوتی رہی، کتاب شاید ان کے ہاتھوں میں تھی، کسی ورق کو پلٹا اور آواز آئی:

''حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ'' پھر مثنوی کے دو شعر پڑھے۔

ستاروں کو پھاڑے اسی کا عذاب
کھلائے وہی آسماں پر گلاب
گلابوں پہ اڑتی ہوئی تتلیاں
سماوات میں رینگتی چیونٹیاں

PDF Compressor Free Version

''حق اللہ حق اللہ..... بھائی! آپ کی کتاب کی تصویریں بھی، متن سے کم حیرت انگیز نہیں ہیں۔ مجھے یہ بتایئے کہ آسمان میں کھلتے ہوئے گلابوں، اڑتی ہوئی تتلیوں اور رینگتی چیونٹیوں کی تصویریں آپ نے کیسے مہیا کرلیں۔'' جواباً عرض کیا:

''ساری تصویریں امریکہ کے اسپیس ایجنسی NASA کے انفراریڈ اسپیس کیمرے سے کھنچی ہوئی ہیں۔ میں نے ایسی بہت ساری تصویروں کا ایک البم تیار کر رکھا ہے، کہئے تو ای میل سے بھیج دوں۔''

حکم ہوا: ''فوراً، ابھی، اسی وقت'' اور میں نے پورا البم پوسٹ کر دیا۔ دوسرے ہی دن فون آیا اور ایک ہفتے کے بعد ایک خط، خط کی پیشانی پر لکھا تھا:

''حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ'' اس حق اللہ کی تھرتھراہٹ اور فنا فی اللہ جیسی کیفیت کا ادراک تو اسے ہی ہو سکتا ہے، جس کی سماعتوں نے اس آواز کی تڑپ محسوس کی ہو۔ ایسے میں کسی سامع و قاری نے اس ''بابا سائیں'' کو اس عہد کا جنید و منصور کہہ دیا ہے تو اعتراض کیسا؟

ایک دن ٹیلیفون پر بات کرتے ہوئے، اچانک مجھ سے پوچھ بیٹھے: ''تم نے مجھے پڑھا ہے؟'' سچ تو یہ تھا کہ اُس وقت تک نہ تو میں نے ان کی کوئی کتاب پڑھی تھی نہ ہی میری ذاتی لائبریری میں ان کی کوئی کتاب تھی۔ بڑی پشیمانی ہوئی، مگر نہ جانے کیسے منہ سے نکل گیا:

''اچھے اچھے آپ کو نہیں پڑھ سکے ہیں، میں کس کھیت کی شلجم ہوں۔'' بابا سائیں نے شاید میری جہالت بھی بھانپ لی اور مجھے بھی۔ کچھ دنوں بعد رجسٹرڈ پارسل سے دو ضخیم پیکٹ ملے، کھولا تو دیکھا شکیل صاحب کی کتابوں کا ایک ذخیرہ ہے۔

''ہند مغل جمالیات'' سے لے کر ''در بھنگے کا جوڑ کر کیا'' تک کل بارہ کتابیں تھیں۔ کتابوں سے سرسری گزرتے ہوئے، نگاہیں ''در بھنگے کا جوڑ کر کیا'' پر ٹک گئیں۔ انتساب کے صفحے پر لکھا تھا:

مشتاق احمد نوری..... کے نام

تم نے دباؤ نہ ڈالا ہوتا تو یہ صفحات کب لکھے جاتے

میری نظر میں ''بابا سائیں'' کا قد اور اونچا، بہت اونچا ہو گیا۔ وہ بابا سائیں جن کی کتابوں کے انتسابی صفحے پر ابو الکلام آزاد، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، ستیہ جیت رائے، جیسے نام آتے ہیں، وہیں ایک نام مشتاق احمد نوری کا بھی ہے، تو کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ بابا سائیں نے ادب کے میناروں کے ساتھ مشتاق احمد نوری کو بھی کھڑا کر دیا ہے۔ عام لوگوں کا کچھ ایسا ہی خیال ہوگا بلکہ خواص میں سے کئی یہی سمجھتے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بابا سائیں کی شخصیت اور فن دونوں کو ہی complecated جانا مانا جاتا ہے۔ یہی بابا سائیں ہیں جنہوں اپنی کتابوں کو ''بابا سائیں کے نام''، ''مینا کے نام''، ''لالہ رخ کے نام''، ''اپنے پوتے عرفی کے نام'' بھی معنون کیا ہے۔ دل نے کہا، یہی وہ مقام ہے کہاں جہاں مشتاق احمد نوری مقیم ہیں۔ ابو الکلام، سردار جعفری یا ستیہ جیت رائے جیسے سارے نام تو محض بدن ہیں اور دوسری فہرست کے سارے نام بدن کا عمق ہیں، بدن کی گہرائیاں ہیں، بدن کا سچ ہیں۔ ایک کتاب خود اپنے نام سے منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُس شکیل الرحمٰن کے نام جس کے جسم میں آگ کا ایک دیوتا دفن ہے۔''

آگ کا وہ یونانی دیوتا، شکیل الرحمٰن کی حقیقت ہے، جو ان کے جسم میں دفن ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن ''بابا سائیں'' کی جمالیاتی تنقید کو سمجھنے سے پہلے ان کو سمجھنا ہوگا، پھر ان کی لفظیات میں ڈوبنا ہوگا۔ تنقید کی ماہیت پر لکھتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''تنقید دراصل حکمت دوانائی کا فلسفیانہ اظہار ہے۔''

بابا سائیں! ہم نے تو ایک محفوظ فاصلے سے، پرسکون ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی اوپری سطح ہی دیکھی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان لہر بہر بل کھاتی موجوں کے اندر اور اندر کتنی اور کیسی کیسی زیریں لہروں کی کاٹ ہوگی، نہ جانے کتنے بھنور دھمال کر رہے ہوں گے۔

بابا سائیں آپ نے جو کچھ سوچا ہے، لکھا ہے، سب سچ ہے، یہ بھی سچ ہے کہ آپ کے.....

''قد کا بڑا حصہ تو آئینے کی پشت پر ہے، اسے اب تک کس نے دیکھا ہے۔''

بابا سائیں! تنقید کا یہ سچ بھی آپ کی سچائی ہے کہ:

PDF Compressor Free Version

''کسی فنکار کے فن میں جھانکنے کے لئے عارفانہ نگاہ چاہئے..... یہ جھانکنا دراصل بـــدھیت کی طرح ڈوب جانے کا عمل ہے۔''

ڈوبنے کے بعد ہی سمندر کی گہرائیوں سے خزانے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جو مسرت وکیف وسرور کے لمحے میسر آتے ہیں، جمالیات کا نچوڑ ہیں۔ اپنے غم والم میں بھی ڈوب جایئے، جہاں ایک جمال آفریں مسرت ولذت یعنی بدھیت کا آنند آپ کا منتظر ہے۔

مجھ پر ماہ وسال کی آپا دھاپی اور شب وروز کی سفاکی سے ایسا زمانہ بھی گزرا ہے کہ کئی مہینے تک بابا سائیں سے بات نہ ہوسکی۔ انہیں ایام میں اچانک اماں سائیں کا ایک فون آیا، کہنے لگیں:

''بابا سائیں کی طبیعت ان دنوں کچھ زیادہ ہی ناساز ہے۔ ہاسپیٹل میں ہیں، آپ کو یاد کررہے ہیں، لیجئے بات کرلیجئے۔''

دل اچھل کر حلق تک آگیا۔ ٹیلیفون پر بابا سائیں کی تھکی تھکی سی، مگر مردانہ آواز سنائی دی:

''میاں! دل کی دھڑکنیں کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہیں۔ آپریشن سے گزرنا ہے، تم صوم وصلوٰت کے پابند ہو، دعا کرو، اللہ آسانیاں پیدا کردے۔ تمہاری مثنوی سرہانے رکھی ہوئی ہے، تمہارے ہی شعر تمہیں سنانا چاہتا ہوں، سنو۔

ہے تحصیل علم ادلیں آشرم
عمل اور پیہم عمل ہے دوئم
سوئم آشرم تیاگ کا گیان کا
چہارم ہے سنیاس کا دھیان کا

اسلم بدر الفظ ''آشرم'' سے مجھے بڑی انسیت سی ہے۔ ایک ''آشرم'' تو میری بھاگتی دوڑتی زندگی کا عکاس آئینہ ہے۔ دوسرا ''آشرم'' میرا گھر بھی ہے اور گھر کا نام بھی۔ ساری ہماہمی تیاگ کر میں نے اس آشرم میں پناہ لے لی ہے۔ مگر اب تیزی سے میرے قدم ''چہارم آشرم'' کی طرف بڑھ رہے ہیں..... ''حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ.....'' ساعتوں پر کہرہ چھانے لگا ہے، رونا چاہتا ہوں، مگر آنکھیں صحرا ہوچکی ہیں۔ دھیان تو ''حق اللہ.....'' کی بازگشت میں محو ہے، سوچ مجھ سے سوال کررہی ہے، ذرا کوئی اس شخص کی گتھیاں سلجھادے، کیا چیز ہے یہ شخص؟ کل اللہ کے کائناتی جمال سے، بلکہ قرآن کے جمال سے بلکہ اللہ کے جمال سے گزرتے ہوئے حق اللہ، حق اللہ کا نعرۂ مستانہ بلند کررہا تھا۔ آج انسانی زندگی کے وید انتک اصولوں سے گزرتے ہوئے حق اللہ، حق اللہ کررہا ہے۔ یہ بھی حق اللہ..... وہ بھی حق اللہ۔

کسی ماہر نفسیات کا قول یاد آگیا: ''انتہائے نفی، اثبات سے بدل جایا کرتی ہے اور انتہائے اثبات، نفی سے'' نفسیاتِ عشق میں بھی ایسے مراحل آتے ہیں کہ جب اپنا محبوب محض اپنا نہیں ہوتا، سب کا ہوجاتا ہے اور جو سب کا ہے اپنا بھی ہے۔ انتہائے غرض مندی، بے غرضی میں بدل جاتی ہے اور انتہائے بے غرضی، غرض میں۔ یہاں پہنچ کر رقابت کی کہیں کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اپنا ایک شعر یاد آگیا۔

کہیں افق پہ چمک اے دعائے شام مری
تو ماہتاب مرا ہے، کسی کی چھت پر آ

یہ تو وہ عالم عشق ہے جہاں پہنچ کر، عشق، زمان ومکان کی سرعت و وسعت کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا ہے۔ زمان ومکان میں اتنی وسعت کہاں کہ عشق کو سمیٹ سکے۔

ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر (اقبال)

اس واقعے کو بھی کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میں خود دل کا مریض ہوں۔ تین آپریشن سے گزر چکا ہوں۔ چوتھے کے لئے برلا ہرٹ ریسرچ انسٹی میں لایا گیا ہوں۔ اوپن ہرٹ آپریشن بھی کامیاب گزر چکا ہے، مگر آئی سی یو میں تیسرے دن اچانک حالت کچھ بگڑ گئی ہے۔ کچھ بولنا چاہتا ہوں مگر آواز حلقوم میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ پھیپھڑے میں پانی بھر رہا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اللہ نے موت سے قبل آواز چھین لی ہے، مگر اللہ نے گھر والوں کی دعائیں سن لی ہیں۔ اب میں آئی سی یو سے جنرل وارڈ میں بھیج دیا گیا ہوں۔ آواز اب بھی صاف نہیں ہوسکی ہے۔ کچھ بولنے کی کوشش میں کھانسی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ صورت حال سے کافی پریشان ہوچکا ہوں۔ بابا سائیں یاد آجاتے ہیں۔ بیگم سے کہا ہے:

PDF Compressor Free Version

''ذرا 'بابا سائیں' کے نمبر ڈائیل کرو۔''

بیگم تیار نہیں ہیں، مگر میری ضد کے آگے نہ جانے کیا سوچ کر گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ بابا سائیں سے کچھ دیر تک خود باتیں کرتی رہیں اور پھر میری طرف فون بڑھا دیا۔

میں نے ابھی فون پر ''بابا سائیں'' ہی کہا ہے کہ کھانسی کے دورے شروع ہو گئے۔ کیا بے کسی و بے بسی کا عالم ہے۔ دھاڑیں مار کر رونا چاہتا ہوں مگر رو بھی نہیں سکتا، بس ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بابا سائیں کی آواز آئی اور آتی چلی گئی ہے:

''اسلم بدر! اتنے بزدل ہو تم..... موت سے ڈرتے ہو، اس موت سے جو زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے، اس عظیم سچائی سے ڈرتے ہو، جس کے آگے حیات و کائنات کے سارے نقش و نگار جھوٹے ہیں۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا، روک دیا گیا۔

''تم سب کچھ کہہ چکے ہو، اب بالکل خاموش رہو، صرف میری سنو۔ میں بھی ان حالات سے گزر چکا ہوں مگر مجھے رونا کبھی نہیں آیا، مجھے معلوم ہے کہ اپنی موت کے بعد فوراً زندہ ہو جاؤں گا۔''

ہر زمانے میں ایسے لوگ تو ملتے ہیں، جنہوں نے خدا کا انکار کر دیا ہے، مگر ایسے لوگ کسی زمانے میں نہیں پائے گئے، جنہوں نے موت کا انکار کیا ہو۔

بہت دیر تک بابا سائیں بولتے رہے، میں سنتا رہا۔ بابا سائیں مجھے ''موت کی جمالیات'' سمجھا رہے تھے۔ ایک ایک لفظ میری گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے دنیا کی ساری سچائیاں جھوٹی لگنے لگیں۔ بڑی ڈھارس بندھی۔ بابا سائیں نے اقبالؔ کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کی ۔

نشان، مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

میرا گھر بار، میرے احباب گواہ ہیں کہ بابا سائیں کی اُس پیاری سی ڈانٹ اور موت و حیات کی جمالیاتی وضاحت کے بعد میں اپنے اندر لوٹ آیا، بتدریج میری آواز بھی واپس لوٹ آئی، اس کے بعد سے آج تک میں نے دل کو اپنے دماغ پر چڑھ آنے کی اجازت کبھی نہیں دی۔ معلوم ہوا:

بابا سائیں، ماہر جمالیات ہی نہیں، ماہر نفسیات بھی ہیں

❁❁❁

جب بھی منصور کے بارے میں سوچتا ہوں آنکھوں کے سامنے ایک تصویر آ جاتی ہے۔ منصور رقص کرتے ہوئے جانب دار بڑھ رہے ہیں۔ مجھے اس تصویر یا متحرک منظر سے ہمیشہ مسرت اور آسودگی حاصل ہوتی رہی ہے اور زندگی کا بنیادی سبق ملتا رہا ہے..... میں سرو (Cypress) کی طرح رہا ہوں، اس درخت کی طرح جو ہمیشہ سرسبز رہتا ہے اور جس کے پتے خوبصورت ہوتے ہیں۔

بڑھتا گیا ہوں اور ہوا، طوفان، سورج اور بادلوں سے بہت پریشان بھی رہا ہوں، بہت تکلیف اٹھائی ہے۔

لیکن اس سے فائدہ بھی ہوا ہے

تجربہ کار ہوتا گیا ہوں

ہر قسم کے موسم کو برداشت کرتے کرتے تجربوں میں اضافہ ہوتا گیا ہے

مجھے یقین ہے

میری موت کے بعد بھی اس درخت کے جوہر کام آئیں گے۔

غالباً میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ذمہ دارانہ عہدوں پر اکثر سقراط بن جاتا ہوں اور زہر کا پیالہ بخوشی پی جاتا ہوں۔

میں نے سانڈوں کی سینگوں کو ہمیشہ سامنے سے پکڑا، کبھی شکست ہوئی بھی تو میری ہی فتح کا نقارہ بجا۔

(پروفیسر شکیل الرحمٰن)

PDF Compressor Free Version

کہکشاں تبسم

C/o Ziyaul Islam Rizvi, Sabur College Sabur
Bhagalpur 813210 (Mob. 5651449489)

آشرم کے حوالے سے.....

خودنوشت کسی بھی مصنف کے ذہنی اور فکری رویوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کے انہیں واقعات کا ذکر ملتا ہے جس نے مصنف کے شعور و لاشعور پر کہیں نہ کہیں گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس طور پر کسی خودنوشت کو پڑھتے ہوئے مصنف کے نہ صرف سماجی اور تہذیبی بلکہ فکری پس منظر کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

''آشرم'' بابائے جمالیات شکیل الرحمٰن کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ اس میں درج واقعات کی روشنی میں مصنف کے فکری جہات کو سمجھنے میں تو مدد ملتی ہی ہے ساتھ ہی دو عظیم تہذیبوں کے حسین سنگم کی علامت کے طور پر بھی اس کتاب کا حسن توجہ کا طالب ہے۔ قاری پر شکیل الرحمٰن کے خوب صورت بیانیہ کا جادو بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی عمدہ اور دلکش تخلیقی نثر کا خالق ایک ناقد ہے۔ ''آشرم'' نثری بیانیہ اور شاعرانہ رمز کے حسین امتزاج سے وجود میں آیا ہے۔

مذکورہ کتاب میں سب سے پہلے قاری کی نظر انتساب پر ٹھہرتی ہے۔ جو ایک بزرگ عنایت خاں کے نام ہے۔ نیچے انہیں کا قول بھی درج ہے کہ کائنات ایک سمندر ہے اور انسان اس کا محض ایک قطرہ جس نے اپنے باطن کی گہرائیوں کا سفر طے کرلیا، اس کے لئے کائنات دل کے سمندر کا محض ایک بلبلہ نظر آتی ہے۔ گویا دل کی دنیا یا باطن کی پر اسرار بے کراں روشن دنیا کے جلووں کے آگے کائنات کا وجود صفر بن جاتا ہے۔ ایسے فلسفیانہ اور صوفیانہ خیال و فکر کے جلوے شکیل الرحمٰن کے حسی تجربوں کو سحر انگیز بنا دیتے ہیں۔

''آشرم'' ماضی کی بازیافت ہے، جس میں کہانی کی صورت چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیان ہے اور بیچ بیچ میں ڈائری کے حوالے سے درج جملے غضب کے شاعرانہ جمال سے بھرپور ہیں جو نثری نظموں کا سا ذائقہ دے جاتے ہیں۔ ''آشرم'' دراصل شکیل الرحمٰن کا آبائی مکان ''محمد جان منزل'' ہے جہاں انہوں نے بچپن سے جوانی تک کا اہم سفر طے کیا تھا۔ یہ حویلی محض اینٹ گارے کا پیکر نہیں بلکہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت بھی ہے جہاں دو مختلف مذاہب اور دو مختلف نظریہ حیات کے ماننے والوں کے شب و روز بسر ہوتے تھے۔ جہاں شب برات کے ساتھ دیوالی کے دیپک بھی جگمگاتے، عید کی سوئیاں خوشبو بکھیرتیں، ہولی کے رنگ پنکھ کھولتی جوڑتی تتلیوں کی طرح اڑا کرتے، جہاں نوحہ خوانی کی مجلسیں آنسوؤں سے وضو کرتیں اور قوالی کی محفلیں ''حق'' کے نعروں کے جادوئی آہنگ سے مست مست ہوا ٹھتیں۔ جہاں اساطیری اور مافوق الفطری قصوں کی طلسمی فضا تحیر کی انوکھی دنیا کی سیر کراتی کہ تخیل کا گھوڑا بے لگام اڑانیں بھرنے لگتا، جہاں تاریخی اور مذہبی واقعات سے بھرپور حکایتیں روحانی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی امین بن جاتیں۔ ''آشرم'' اسی تاریخی، تہذیبی اور ادبی شعور کی تربیت گاہ ہے ۔

عام طور سے بچپن گھروں کی بڑی بوڑھیوں سے قصے، کہانی سنتے ہوئے گزر جاتا ہے، مگر کتنے ہیں جنہوں نے ان کہانیوں کی طلسمی فضا کو، اس کے کرداروں کے جلال و جمال کے تحرک کو پوری سچائی کے ساتھ اپنے اندر جذب کیا ہو؟ شکیل الرحمٰن نے نہ صرف ان قصوں، حکایتوں اور داستانوں کے جلال و جمال کو اپنے اندر جذب کیا ہے بلکہ مختلف سطحوں پر ان سے انوکھا رشتہ قائم کر کے خود کی ایک پر اسرار اور روشن دنیا خلق کر لی ہے۔ اس طرح ان کے جمالیاتی وجدان کی ایک رنگا رنگ کائنات وجود میں آگئی جس کے دل پزیر جلوے ان کی تحریروں میں جھلک مارتے دکھائی دیتے ہیں، جیسے دیوالی کے ان گنت دیپ ذہن کے بام و در پر جھلملا رہے ہوں۔ ایک اقتباس دیکھئے:

PDF Compressor Free Version

''موتی جھیل اور ہمالیہ کی وہ برف پوش چوٹیاں جو اسے حویلی سے نظر آتی تھیں، آم کا وہ درخت کہ جس سے پہلی دوستی کی تھی، ہارسنگھار کا وہ پیڑ..... جسے امی نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اور جس کے ہر پھول میں ان کے وجود کی خوشبو رچی بسی تھی..... حویلی کا وہ ویران کنواں کہ جس کے متعلق بچپن سے یہ سنتا آیا کہ اس کے اندر کوئی جن رہتا ہے جو راتوں میں حویلی کی چھت پر چڑھ کر ٹہلتا دوڑتا ہے، بنگلے کے پیچھے ناریل کے دو عجیب و غریب درخت کہ جن پر کبھی پھل نہیں آئے..... مشہور یہ تھا کہ ان پر دو چڑیلیں رہتی تھیں جو اکثر تاریک شب میں اترتی ہیں اور تیز ہواؤں کی مانند رقص کرتی ہیں۔ نانا جان کا وہ گھوڑا کہ جو اسے کبھی نہیں ملا، لیکن جس پر بیٹھ کر اپنے تخیلی میں اس نے جانے کہاں کہاں کا سفر کیا ہے، گنگا کہ جس نے زندگی کی معنویت اور لامعنویت کو اپنے طور پر بار بار سمجھایا۔'' (آشرم، ص ۵۳)

''آشرم'' میں ان کے علاوہ سندباد، قلندر، جنگل، پرندے، اڑتے ہوئے بادلوں میں تخیلی پیکر کی تشکیل اور کاغذ یا زمین پر لکیریں کھینچنے کا عمل، یہ ساری باتیں نہ صرف شکیل الرحمان کے فکری رویوں سے آشنا کراتی ہیں بلکہ ان کے ذہنی اور جذباتی رشتوں کا پتا بھی دیتی ہیں، جس کا اظہار انہوں نے ایک جگہ لوں کیا ہے:

'ابتدائی زندگی کی کچھ علامتیں ایسی ہیں جو اپنی قوت اور توانائی سے ذہن کو آنے والے وقت تک پہنچا گئی ہیں۔''

(ایک علامت کا سفر، ص ۱۰)

شکیل الرحمٰن کے جمالیاتی وجدان میں درخت کا پیکر اپنی گھنی شاخوں اور پھیلی ہوئی گہری مضبوط جڑوں کے ساتھ موجود ہے، جو اکثر ایک زندہ کردار میں ڈھل کر ان کے تھکے ہارے وجود کو نرمی سے سمیٹ لیتا ہے، اپنی چھاؤں کی خنکی بخشتا ہے، زخموں کو سہلاتا ہے اور درد بانٹ لیتا ہے۔ ''آشرم'' میں بالخصوص ہارسنگھار اور آم کے درخت سے مصنف کی جذباتی وابستگی قابل توجہ ہے کہ جیسے یہ ان کے وجود میں جذب ہو گئے ہیں۔ جذب کی یہ کیفیت ان سے جڑی یادوں کو روشنی، رنگ اور خوشبو سے بھر دیتی ہے۔

''درخت'' ان کے یہاں ماضی کی طاقت ور علامت کی صورت موجود ہے۔ گھنا، سوچتا ہوا، ٹھنڈی چھاؤں والا، جو دوست کی طرح دلدار بھی ہے اور ماں کی طرح شفیق اور مہربان بھی کہ اپنے سائے میں سمیٹ لیتا ہے۔ سندباد بھی مسلسل سفر کا علامتی پیکر ہے کہ اس نے ایک درخت کاٹ کر کشتی بنائی تھی اور تب دور دراز کے لمبے سفر پر نکلا تھا، مگر شکیل الرحمٰن کے جمالیاتی وجدان کا اہم پیکر بن چکا درخت اپنے پورے سراپے کے ساتھ ان کے طویل سفر میں شامل رہا ہے۔ کبھی ماں کی طرح آغوش میں سمیٹے، کبھی دوست کی طرح شانوں پر ہاتھ دھرے اور کبھی گیان دھیان کے لمحوں میں سایہ فگن، کبھی پھیل کر وسیع جنگل کی صورت اختیار کرتا ہوا۔ ہارسنگھار کا پیڑ، اس کے نازک پھولوں کی خوشبو اور رنگ بھی مصنف کی یادوں میں ماں کے وجود کی صورت نقش ہیں۔ آم کے درخت سے ان کی گہری جذباتی وابستگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ اس کے تنے پر شکیل الرحمٰن نے بچپن میں اپنے نام کا پہلا حرف ''ش'' لکھ دیا تھا۔ گویا درخت ان کے یہاں ایک وسیع تناظر میں موجود ہے۔ وہ ماضی کی صدیوں پھیلی ہوئی تاریخ کی علامت بھی ہے، مسلسل سفر کا استعارہ بھی، ماں اور بچے کے خوبصورت، گہرے اور پائیدار رشتے کی پہچان بھی۔ درخت شکیل الرحمٰن کے پراسرار جمالیاتی وجدان کی اہم شناخت ہے۔ جب باغ کے درختوں کی کٹائی میں آم کا وہ درخت بھی کٹ گیا تو اس کے ٹکڑوں کو بیل گاڑی پر لادتے دیکھ کر شکیل الرحمٰن کو اپنی امی کا جنازہ یاد آ گیا۔ آم کے درخت سے جذباتی وابستگی کی یہ شدت یوں بھی پتا چلتی ہے کہ:

''آج بھی آم کا کوئی پتا مل جاتا ہے تو وہ اسے توڑ کر ضرور سونگھتا ہے اور یہ خوشبو اسے اس درخت تک لے جاتی ہے۔'' (آشرم، ص ۵۱)

بچپن میں جب مصنف کی رسم بسم اللہ ہوئی تھی تو مولوی صاحب کے ساتھ اسی آم کے درخت کی چھاؤں میں شاگرد بن کر بیٹھنے کا تجربہ ماں کے آنچل کے سائے میں بیٹھنے جیسا معلوم ہوا۔ بھلا سندباد کو ایسے تجربے

PDF Compressor Free Version

کب ہوئے ہوں گے۔ پہاڑوں، ندیوں، جھیلوں، پرندوں، تتلیوں، درختوں اور مہکتے پھولوں کے رنگوں نے انہیں محسوسات کی ایک دھنک رنگ دنیا بخش دی۔ فطرت کے دل فریب حسن کی کشش نے مصنف کو نہ صرف مسحور کیا بلکہ اپنی گرفت میں بھی اس طرح لے لیا کہ زندگی کے انوکھے رمز اور اسرار کا تحیر آشکار ہوتا چلا گیا۔ فطرت کے تعلق سے والد کی یہ تاکید انہوں نے گویا گرہ میں باندھ لی کہ:

''اس کتاب کو بھی پڑھا کرو، جانتے ہو انہیں کسی کتاب کے ذریعہ نہیں پڑھا جاسکتا، یہ اللہ میاں کا قاعدہ ہے۔''

(آشرم، ص ۴۰)

فطرت کے تئیں اس فکری بیداری نے پوری دنیا کو جیسے شکیل الرحمٰن کے وجود میں ضم کر دیا۔ اللہ کے قاعدہ کے ساتھ اردو قاعدہ پڑھتے ہوئے کالے کالے، ٹیڑھے میڑھے حروف اپنی انوکھی اور غیر معمولی قوت کا احساس دلانے لگے۔ حرف لفظوں میں اور لفظ جملوں کی اکائی بن کر الگ الگ تصویروں میں ڈھل جاتے پھر نت نئے خواب کی تشکیل کرتے۔ سیاہ رنگ کی معجزاتی قوت کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ:

''سیاہ رنگ کے اندر سارے رنگ ہوتے ہیں اور ہر رنگ جانے کتنی کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔'' (آشرم، ص ۴۱)

ایسی نہ جانے کتنی کہانیاں شکیل الرحمٰن کے وجدان کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔ اکثر تنہائی کے لمحوں میں ان تجربوں سے جڑی یادوں کو سہیج کر رکھنے کے لئے زمین یا کاغذ پر بے اختیار انگلیوں سے خاکہ بنانے کا عمل توجہ طلب ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے، لیکن اہم واقعات کو یہ خاکے علامتی صورت میں طویل عرصے کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں کہ ان میں مخصوص لمحوں کی یادیں کسی تصویر کی صورت نقش ہو جاتی ہیں، جو مدتوں بعد بھی ماضی کے بھولے بسرے لمحوں کی بازیافت میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مختلف تجربوں کو گرفت میں لینے کا یہ عمل فن مصوری سے مصنف کی گہری قربت کا پتا دیتا ہے۔ ہندسوں کی انوکھی ترتیب سے مندر کا نقشہ بنا دینا بھی اسی رجحان کا آئینہ دار ہے۔

''آشرم'' پڑھتے ہوئے شکیل الرحمٰن کے فکر و شعور کے علاقے کی سیر سے بھی قاری خوب لطف و انبساط حاصل کرتا ہے۔ دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریاں ہوں یا قحط بنگال کی ہولناکیاں، کانگریس اور مسلم لیگ کی متضاد سمتی تحریکیں ہوں یا زبان کا مسئلہ، انگریزی سامراج کا ظلم و جبر ہو یا معصوم عوام کی لاچاری اور جوشیلی نادانی۔ ان سب کے اثرات بہار اور ہندوستان کی بے بس آبادی پر کس کس طرح پڑے، اپنے وقت کے تناظر میں ان کی تصویریں خوب صورت اور بلیغ جملوں میں روشن ہیں۔ مثلاً:

''ہندوستان کے عوام جنگ میں شریک نہ تھے، لیکن اسے کیا کہئے کہ جنگ نے غلام ملک کو ہر جانب بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا..... گول گھر کبھی اوپر تک نہیں بھرا، اوپر سے ایک بڑا سوراخ ہے جس سے اناج اندر ڈالا جاتا تھا۔ غور کرو تو لگتا ہے جیسے منھ کھولے اناج مانگتا جا رہا ہو۔ صرف گول گھر سے بہار میں برطانوی حکومت کے ظلم و ستم اور سفاکانہ رویے کو سمجھا جاسکتا ہے..... دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ بعض تحریکیں بہار سے چلی ہیں اور انہیں دوسرے لوگوں نے اچک لیا ہے اور اس ریاست کے لوگ اطمینان سے اپنی پرانی زندگی کی جانب لوٹ گئے ہیں..... فرقہ پرستی کے اس دور میں کوئی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ ہماری تاریخ اور ہمارا حال ہندوستان کا تجربہ ہے۔ ہم جن اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں وہی ہندوستان ہے..... وہ لوگ کتنے بھولے اور معصوم ہیں (اور کس قدر خطرناک) جو یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری زبانوں کی لاشوں پر ایک مصنوعی زبان کا ڈھانچا کھڑا کر کے اپنا ایک کلچر خلق کر لیں گے؟ نتیجہ ظاہر ہے قدروں کا تسلسل رک گیا ہے، ثقافتی قدریں ٹوٹ رہی ہیں۔ شمالی ہند کا یہ المیہ اس عہد کا انتہائی الم ناک حادثہ ہے..... آزادی کے بعد ہندوستان کی بعض ترقی پسند سیاسی جماعتیں علاقائی امراض میں گرفتار ہو رہی ہیں کیا ان جماعتوں کو اپنے ملک کی تہذیبی وحدت اور وحدت میں کثرت کے جلوؤں کا واقعی احساس نہیں رہا ہے؟..... علاقائی گھوڑوں پر بیٹھ کر یہ جماعتیں شان سے دوڑ سکتی ہیں، اپنے کرتب دکھا سکتی

PDF Compressor Free Version

ہیں، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ علاقائی جماعتوں کی صورتوں میں کبھی خطرناک قسم کے زہریلے کیڑے بھی اِدھر اُدھر سے نکلنے لگیں اور ان کے لئے چیلنج بن جائیں۔"

(آشرم، ص ۱۰۲ و ص ۱۱۴ و ص ۲۱۱ تا ص ۲۱۳)

ان نمونوں سے شکیل الرحمٰن کی فکری جہت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی دردمندانہ شخصیت اپنے عہد میں ہونے والی تبدیلیوں سے کتنی باخبر تھی، درک نگاہی کی مثالیں آشرم میں الماس کی صورت بکھری پڑی ہیں۔ مصنف کا دل نشیں اور شاعرانہ نثری اسلوب "آشرم" کا ایک توجہ طلب پہلو ہے۔ یہ خودنوشت شکیل الرحمٰن کی شگفتہ تخلیقی نثر کی عمدہ مثال ہے۔ بعض جملے افسانوی حسن سے لب ریز ہیں اور اپنے اندر معنوی جہات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ شاعرانہ حسن کے جلوؤں سے بھرپور "آشرم" کے یہ چند جملے بہ طور نمونہ دیکھئے:

"سایہ کوئی دلکش پیکر بن گیا، بیتے لمحوں کو لئے رقص کرنے لگا..... وہ کوئی ہیولا نہ تھا، سنہرے بدن کا دل فریب آئینہ تھا۔" (ص ۲۲)

"اپنے صنم کدے کی تخلیق کے لئے اسی شہر نے قشقہ کھینچنے کی تربیت دی تھی۔" (ص ۲۲)

"جب بھی کسی درخت کو دیکھتا ہوں اس کی شخصیت محسوس ہونے لگتی ہے۔" (ص ۴۸)

"فطرت نے اپنی بے لوث محبت کی ایک دنیا سامنے رکھ دی ہے، ممتا ہر جانب ہاتھ پھیلائے بلا رہی ہے، پیشانی پر بوسے دے رہی ہے، پیار کر رہی ہے۔" (ص ۶۰)

"موت آہستہ آہستہ دبے پاؤں آئی اور مٹی کے جسم سے زندگی چرا کر لے گئی۔" (ص ۷۳)

"یزیدوں کے درمیان جب بھی اس نے محسوس کیا ہے کہ وہ تنہا حسین ہے، حسین قلندر کی صورت اختیار کر بیٹھا ہے۔" (ص ۷۸)

"اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ اپنی آنکھ کے اندر رہے۔ اپنے وجود کے آشرم میں!" (ص ۱۵)

"ماضی ایک کائنات ہے اس کا مکمل سفر ممکن نہیں ..... صرف وہ 'نگاہ' جو آنکھ کے اندر ہوتی ہے، ماضی کے بعض علاقوں کا سفر کر لیتی ہے۔" (ص ۱۶)

"اندھیرے میں نوری لکیروں کی تلاش میں سرگرداں رہا، جب بھی کوئی روشن، منور اور متحرک لکیر ملی تو اسے اپنی نگاہوں سے چوم لیا۔" (ص ۱۶)

"میرا ماضی ایک آئینہ خانہ ہے..... ہر آئینہ، ہر شیشہ میری روح، میرے وجود کا حصہ ہے۔" (ص ۱۷)

"کبھی محسوس ہوتا ہے میرا ماضی قطرۂ خون کی مانند میری پلکوں پر جم گیا ہے..... میری زندگی میں جتنے چراغ روشن ہیں سب اسی محفل سے آئے ہیں۔" (ص ۱۷)

"ایک وقت تھا جب یہ شہر اس کے وجود کے شوالے کا کلس تھا جس سے شعاعیں پھوٹتی تھیں۔" (ص ۱۹)

"یہ شہر ماں بن کر پریوں کی کہانیاں سناتا رہا..... اس شہر سے دور جانے کتنی بار سولی پر چڑھا اترا..... اندھے کنوئیں میں جھانکتا رہا، تاریکیوں میں ڈوبا، روشنیوں میں ابھرا۔" (ص ۲۱)

"بچھڑے ہوئے دنوں کا ایک گہرا سایہ اس کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔" (ص ۲۲)

"عکس در عکس ہر جانب اسی کا سراپا تھا۔" (ص ۲۲)

"زعفرانی ساڑیوں نے سانولے بدن کو چھپا لیا۔ موتی جیسے سیپ میں واپس چلے گئے ہوں۔" (ص ۲۰۵)

"ہندوستان کے قدیم ترین مابعد الطبیعاتی تجربوں میں پگھلے ہوئے وقت کا جو تصور ہے کہ جس سے کائنات کی چوتھی جہت کا احساس ملتا ہے، وہ ممکن ہے گنگا کے کنارے تپسیا کرتے ہوئے پیدا ہوا ہو۔" (ص ۲۰۶)

"آشرم" زندگی کے جمال و جلال کے رشتوں کی متحرک کہانی ہے، جس میں شکیل الرحمٰن کی یادوں کی دنیا پنکھ سمیٹتی ہے تو "محمد جان منزل" بن جاتی ہے اور اڑان بھرتی ہے تو ہندوستان بن جاتی ہے۔

PDF Compressor Free Version

خودنوشت میں کئی چھوٹے چھوٹے کردار اس اعتبار سے بیحد اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے مصنف کی زندگی پر اپنے گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ ان جاندار اور متحرک کرداروں میں مولوی منظور حسین، دیوانِ غالبؔ والے مولوی صاحب، مہمان، رامیشور، مادام، پروفیسر مکر جی، پروفیسر سید احمد حسین، شترو گھن پرشاد سنگھ، قلندر اور وہ ننھا چرواہا جس کے گیت کی لَے اور آہنگ اب بھی مصنف کی یادوں میں زندہ ہے۔ ان کے یہاں قلندر ایک کلیدی کردار کی طرح نظر آتا ہے۔ کچھ اس طرح بھی کہ ان کے دادا محترم کسی قلندر کی صحبت سے فیضیاب ہو کر اسلام کی طرف راغب ہوئے اور کئی برسوں کے مطالعے کے بعد مشرف بہ ایمان ہوئے۔ مصنف کے بچپن کے زمانے میں بھی محمد جان منزل میں ایک قلندر کی آمد ہوئی جس کا یہ اقرار کہ وہ صرف مصنف کی خاطر وہاں آیا ہے، پھر اس کا تھیلے سے چاول نکال کر دینا، اسے پکوانا اور بہ اصرار مصنف کو اپنے ساتھ کھلانا اور گرم چاول کا شکر میں بدل جانا، پھر قلندر کا یہ آشیرواد کہ مصنف سب کے لئے شکر ہی رہے گا۔ یہ واقعہ اپنے گہرے اسرار اور تہہ در تہہ معنویت کے ساتھ شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی شخصیت کا حصہ بن گیا ہے۔ قلندر کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ کوئی دنیا چھوڑ کے اپنی ذات میں اس طرح مست ہو جاتا ہے کہ ہر شئے سے غافل ہو جاتا ہے اور کوئی ظاہری دنیا کے تمام مظاہر سمیت اپنے باطن کی دنیا میں ٹھکانا ڈھونڈ لیتا ہے جہاں اس کی ذات کی وسعت اس کے لئے ایک ''آشرم'' ایک پناہ گاہ بن جاتی ہے، جہاں نت نئے اسرار کے جلوے منکشف ہوتے رہتے ہیں، جس میں وجود تو بہ ظاہر دھرتی پر موجود رہتا ہے، مگر روح ساری کائنات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش میں سرگرداں رہتی ہے، جس کے باطن میں سمندر کی گہرائیوں کا سکون ہوتا ہے اور ظاہر شکر کا ڈھیر۔ شکیل الرحمٰن بھی اسی قسم کے قلندر ہیں۔

'آشرم' ہندوستان کا تہذیبی پیکر ہے، جس میں قدیم دیومالائی داستانوں کا سارمز ہے، جس میں ملک کی مٹی کی سوندھی خوشبو ہے، جس میں رگِ جاں میں اترتی معطر ہواؤں کی راگنی ہے جو موسیقی بن کر مختلف گھرانوں کی شناخت بن جاتی ہے، جو متے رقص کرتے پیڑ ہیں جو کبھی منصور تو کبھی روی کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں، جہاں وقت کی قید سے آزاد سچائیاں ہیں جو رنگوں کے قلب میں اترتی ہیں تو مصوری کہلاتی ہیں اور کبھی پتھروں میں ڈھل کر خاموش بت۔ یہ دو عظیم تہذیبوں کے عروج کا قصیدہ بھی ہے اور ان کے زوال کا نوحہ بھی۔

شکیل الرحمٰن کی یہ خودنوشت ایک دریچہ ہے ان کے باطن کی پراسرار دنیا کے جلووں کا نظارہ کرنے کا۔ مختلف علامات کے پر پیچ زینوں کا ایک سلسلہ ہے جس سے گزر کر ان کی سائیکی کی طلسمی دنیا کی سیر کی جا سکتی ہے۔ ''آشرم'' صرف اوراق کا مجموعہ نہیں بلکہ مصنف کی باطنی دنیا کا استعارہ بھی ہے جہاں وہ خود ایک قلندر کی طرح براجمان ہیں ع

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

کے مصداق انہوں نے من کی دنیا میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پالیا ہے۔ زندگی جو پیکراں ہے، اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی نیرنگیوں سمیت مصنف پر آشکار ہے۔ اس اعتبار سے ''آشرم'' یادوں کا دھنک رنگ آسمان بھی ہے اور ''محمد جان منزل'' کی جان دار اور بولتی ہوئی تصویر بھی، شکیل الرحمٰن کا باطنی بسیرا بھی جس میں وہ ماضی کے ان گنت بیدار اور پرکشش لمحوں کو سینے اندر کی پراسرار دنیا میں زینہ زینہ اترتے ہیں، جہاں انہیں اپنی ذات کے نت نئے روشن جلووں کے جمال و جلال کی آگہی ملتی ہے، جہاں وقت پگھل کر سیال بن جاتا ہے کہ جب چاہے ماضی کی ہزاروں برس پرانی دنیا کی سیر ہو جائے، جہاں کوئی لکیر نہیں، کوئی تقسیم نہیں، نہ کوئی دائرہ، بس موج موج بہاؤ کی پیکرانی ہوتی ہے جس کا کوئی انت نہیں، جہاں قطرہ بذاتِ خود سمندر بن جاتا ہے، وسیع اور لامتناہی سمندر کہ یہی خودشناسی کی منزل بھی ہے اور شاید خداشناسی کی بھی۔ ❁❁

''میرؔ خوب صورت اکہرے تجربوں کے شاعر ہیں۔ غالبؔ کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ان کے اشعار جہتوں کی شاعری کی خصوصیات لئے ہوئے ہیں۔ میرؔ کی شاعری جہت دار نہیں ہے۔ غالبؔ ہی اپنے وسیع تہہ دار اور جہت دار جمالیاتی وژن سے اردو کی بوطیقا کو ٹریجڈی کی جمالیات کا ایک ڈرامہ پیش کر سکے، یہ میرؔ یا مصحفی کے بس کی بات نہیں تھی۔''

(پروفیسر شکیل الرحمٰن)

PDF Compressor Free Version

پروفیسر شہناز پروین

Karachi, Pakistan

اختر الایمان: شکیل الرحمٰن کے آئینے میں

تنقید لکھنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ شو پنہار نے ایک جگہ اپنے خیال کا یوں اظہار کیا ہے کہ تنقیدی شعور بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے بلکہ یہ اس قدر کمیاب ہے کہ اسے ڈھونڈنا ممکن نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تنقید نگار کے لئے محض اصولِ نقد اور قوانین تنقید سے واقف ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود بھی تخلیقی صلاحیتوں کا حامل ہو، کسی قلم کار کی تحریروں کا جائزہ لینا بہ ظاہر بہت آسان نظر آتا ہے، لیکن جب تک ناقد کے سینے میں بھی اس آگ کی تپش محسوس نہ ہو جو تخلیق کار کے سینے میں لگی تھی، تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے، نہ تنقید کا حق ادا ہوتا ہے، شکیل الرحمٰن کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی جو مجھے نظر آئی وہ یہی ہے۔ ان کی تنقید میں بھی وہی جمالیاتی احساس موجود ہے جو شاعر کے کلام کا خاصہ ہے۔

جدید اردو نظم میں اختر الایمان کا ایک خاص مقام ہے۔ شکیل الرحمٰن نے اختر الایمان کی شاعری کا جائزہ ایک مخصوص زاویہ فکر کے تحت لیا ہے۔ بعض جگہ نظریاتی اختلافات کے باوجود انہوں نے شاعر کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی تحریر میں بھی زبان و بیان کی وہ چاشنی، گھلاوٹ اور شیرینی، نرمی، مٹھاس اور نغمگی خود شکیل الرحمٰن کی تحریر میں رچ بس گئی ہے۔ ان کا قلم ہر سطر پر معنوں کے پھول کھلاتا ہے اور اختر الایمان کی شاعری کی ایک نئی جہت اور نئے امکان سے روشناس کراتا ہے۔ ان کے ذہن میں تنقید کے ایک معیار کے ساتھ ادب کا ذوق بھی ہے، وہ بنے بنائے اصولوں یا برتے ہوئے قوانین کے حوالے سے تحریر کا جائزہ نہیں لیتے بلکہ مخصوص زاویہ نظر رکھتے ہیں۔ اختر الایمان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے کہیں بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جہاں وہ ان کے ذوق جمال کے گرویدہ ہیں وہاں معائب سے بھی پردہ پوشی نہیں کرتے۔ خوبیوں پر تعریفی کلمات لکھتے ہیں تو خامیوں پر بھی کھل کر گفتگو کرتے ہیں، مثلاً ان کی ایک نظم ''کوزہ گر'' کو وہ اچھا احتجاج تو کہتے ہیں مگر زبان کے کھردرے پن کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ وہ اس نظم پر یوں بھرپور تبصرہ کرتے ہیں:

> ''فرسٹریشن (Frustration) کا اظہار کھل کر ہوا ہے، فرسٹریشن آرٹ کی تخلیق کی بنیاد تو ہو سکتی ہے، لیکن صرف فرسٹریشن شاعری نہیں ہو سکتی، زندگی ایک اسرار ہے، جب بھی اسے مسئلہ بنایا جائے گا، دکھ بڑھے گا۔ شاعری ایک پراسرار تخلیقی عمل کا نتیجہ ہے، یہ بھی ایک اسرار ہے، یہ مسائل کے تاثرات تو عطا کرتی ہے، مسائل پیش نہیں کرتی، صرف مسئلے یا مسئلوں کو ابھارنے سے اچھی شاعری وجود میں نہیں آتی۔ اختر الایمان کی شاعری جب مسئلوں میں الجھتی ہے تو جمالیاتی تاثر نہیں دے پاتی، المیہ کا حسن بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اختر الایمان کی اس نظم میں 'شعریت' کا فقدان ہے، بہ ظاہر شخصیت جتنی بے چین نظر آ رہی ہے، داخلی طور پر اتنی بے چین اور مضطرب نہیں ہے، باطنی کرب کی پہچان نہیں ہوتی، الفاظ بوجھل ہیں، تجربوں کا اظہار سپاٹ طریقے سے ہوا ہے، عام لفظوں اور اصطلاحوں میں ایک تقریری ہے، شاعر کا ذہن تو ملتا ہے اس کی وجدانی کیفیت نہیں ملتی۔''

اسی طرح وہ ان کی کئی نظموں کو سوز و گداز اور بلاغت سے عاری قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف شکیل الرحمٰن، اختر الایمان کو جدید اردو شاعری کا ایک منفرد رومانی شاعر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی شاعری روایتی

PDF Compressor Free Version

شاعری نہیں ہے، انہوں نے شاعر کے تجربوں کے ان خاص رنگوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی پہچان بقول ناقد عرصے تک نہیں ہوسکی تھی۔ اس مختصر سی کتاب میں انہوں نے اختر الایمان کی شاعری کے تقریباً تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جگہ جگہ شاعر سے کئے گئے سوال اور پھر ان کے جوابات نے اس کتاب کو اور بھی وقیع اور دلچسپ بنادیا ہے۔ ان جوابات سے جہاں شاعر کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہاں تنقید کی ایک نئی صورت بھی سامنے آتی ہے۔

اختر الایمان رومانیت اور غزل کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب سے شاعری پر سوچنا شروع کیا ہے، مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ ہماری شاعری چند چیزوں کا شکار ہوکر رہ گئی ہے، ان میں سے ایک رومانیت ہے دوسری غزل یا غالباً رومانیت پوری شاعری پر حاوی ہے..... غزل کا میدان بہت محدود ہے، کسی بھی موضوع کو واضح طور پر بیان کرنے کے لئے دو مصرعے کافی نہیں ہوتے اس حد بندی سے نقصان یہ ہوا کہ نئے نئے موضوعات اور ہیئت کے تجربے نہیں کئے جاسکے اور شاعری میں وہ پھیلاؤ نہیں آسکا جو زندگی میں ہے۔''

اسی طرح شکیل الرحمٰن کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے لکھا:

''غزل کے پاس اردو شاعری کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے بلکہ اس نے نئی فکر کے دروازے بند کئے ہیں۔''

اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد تنقید نگار کا زاویہ نظر سامنے آتا ہے:

''اختر الایمان کی اس بات کو کوئی کیسے قبول کرے۔ نظم کے لئے اور نظم میں کھردرے پن کی گنجائش کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ غزل کی مخالفت کی جائے۔''

اسی طرح کبھی کسی بات کے دیباچے کا حوالہ دیتے ہوئے اور کبھی اپنے نام لکھے ہوئے خطوط کی عبارات نقل کرتے ہوئے شکیل الرحمٰن نے تنقید کو بھی ایک ڈرامائی انداز دیا ہے۔ انہوں نے ان اقتباسات کے ذریعے ایک خاص فضا پیدا کی ہے اور شاعر کو سمجھنے کا براہِ راست موقع فراہم کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ شاعر اپنی شاعری کا ایک شعوری احساس بھی رکھتا ہے اور اس کا تخلیقی شعور جاندار ہے۔ بعض مقامات پر اختر الایمان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ خود اتنے جذباتی ہوگئے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یادیں جو شاعر کے ذہن اور دل میں اترتی ہیں، ناقد کے دل و دماغ کے تاروں کو بھی مرتعش کردیتی ہیں، پھر ساز اور آواز کا سنگم ایک جادو سا جگا دیتا ہے۔ ان کا قلم ایک طرف ماہر مصور کی طرح تخیل کے پیکر تراشتا ہے اور دوسری طرف ساحر کی طرح خواب اور خواہشات کی دنیا میں لے جاتا ہے، ایک طلسماتی فضا جو اختر الایمان کی اکثر نظموں کی پہچان ہے، وہی شکیل الرحمٰن کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے۔ نظم ''نشاۃ الثانیہ'' پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''فطرت کے حسن کے سائے میں ایک دلکش کہانی ہے، اس کی یاد ایک خوبصورت نغمے کی طرح آتی ہے، اس نغمے کے آہنگ کی مدد سے شاعر اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے جہاں جامنوں کے جھنڈ میں، شیشم کے درختوں کی چھاؤں میں، کوکلوں اور پپیہوں کی آوازیں ہیں اور ان کے ساتھ جذبات میں ایک شدت ہے۔''

ایک جگہ تبصرہ کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''یہ احساس کتنا دلفریب اور خوبصورت ہے کہ انسان زمین اور زمین کی خوشبوؤں، تنہائیوں اور بے بسی اور کرب کا خالق ہے، وہ خود زمین ہے، اس کے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور آہستہ آہستہ تناور درخت بن جاتی ہیں اور پھل پھول دینے لگتی ہیں۔''

''ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر'' پر شکیل الرحمٰن کا قلم لفظوں کی خوبصورت گل کھلاتا ہے۔ وہ اسے اردو کی بہترین نظموں میں شامل کرتے ہوئے شاعر کے سوزِ آتشیں کو پہلے اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں، پھر شعور کی شراب آتشیں انڈیل کر دل کے تاروں کو چھو لیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

''درد نے رومانیت کو 'پیتھوس' کا آہنگ عطا کیا ہے ..... جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رومانیت میں توازن نہیں ہوتا، ہم آہنگی نہیں ہوتی، انہیں اس نظم کا مطالعہ ضرور کرنا

(بقیہ ص ۶۳ پر)

PDF Compressor Free Version

مسرت جان

Ph.d. Scholar Deptt. of Urdu, Kashmir University, Srinagar

اقبالؔ کی شاعری کا جمالیاتی مطالعہ اور شکیل الرحمٰن

شکیل الرحمٰن نے ''روشنی کی جمالیات'' اور ''محمد اقبال'' جیسی تصانیف لکھ کر اقبالیات کے نئے گوشے اپنے مخصوص انداز میں روشن کیے۔ شکیل الرحمٰن چونکہ بصیرت افروز نقاد ہیں ہر کتاب کے مطالعہ کے دوران بڑی دقت نظری سے کام لیتے ہیں اور کسی بھی موضوع یا شخصیت پر قلم اٹھانے سے پہلے خود کو زیر بحث موضوع میں جذب کرتے ہیں پھر کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ ہر فنکار چونکہ اپنے فن کا اظہار منفرد انداز میں کرتا ہے۔ شکیل الرحمٰن کا انداز تنقید جو انہیں دوسرے نقادوں سے منفرد کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شکیل صاحب فن پارے کی عمیق گہرائیوں میں جھانک کر وہاں موجودہ خوبیوں کو ابھارتے ہیں یعنی موصوف فن کار کے لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانک کے فن کی اصل روح تک پہنچ کر اس طرح حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں کہ نقاد ہی نہیں بلکہ قاری کے ذہن میں بھی حقیقتوں کے راز افشا ہوتے ہیں اور قارئین کے وژن کے حدود وسیع سے وسیع تر ہو جاتے ہیں۔

''روشنی کی جمالیات'' میں نقاد نے ایک نیا تجربہ پیش کیا ہے مذکورہ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شکیل الرحمٰن، اقبالؔ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ''بصارت'' کے بجائے ''بصیرت''، ''وژن'' کو اہمیت دیتے ہیں جس کے ذریعے انسان موجودات کا ہی نہیں بلکہ عدم موجود کا علم بھی حاصل کرتا ہے۔ شکیل الرحمٰن کو اقبالؔ کی شاعری سے یہ تجربہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ وژن یعنی باطن کی بیداری کے متلاشی ہیں جس سے ان چیزوں کا علم ہوتا ہے جو انسان کے تجربات سے باہر ہیں۔ شکیل الرحمٰن اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ اقبالؔ کی شاعری سے جو روشنی ملتی ہے اس کا جمال یہ ہے کہ تجربہ کے ذریعہ وژن پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ وژن کے ذریعہ ہی تجربات ہوتے ہیں لکھتے ہیں:

> ''محمد اقبالؔ کی شاعری جمالیاتی طور پر خبر کا تجربہ نہیں، نگاہ، نظر، وژن اور وجدان کا تجربہ ہے، ان کی نگاہ تجربے کو وجدانی اور حد درجہ حسیاتی بنا دیتی ہے۔'' (شکیل الرحمٰن ''ادب اور جمالیات'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۱)

شکیل الرحمٰن، اقبالؔ کے باطن کو اس قدر بیدار اور روشن پاتے ہیں کہ ان کے بیدار وژن کے سامنے کائنات کے اسرار و رموز آشکار ہوتے ہیں۔ شکیل الرحمٰن، اقبالؔ کو ان بڑے فنکاروں میں شامل کرتے ہیں جن کے وجدانی تجربے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے جو اپنے زمان و مکان سے ماورا ہو کر دور کی دنیا کے تجربوں کو اپنے وجدان کے ذریعہ لفظوں، تشبیہوں، استعاروں، پیکروں اور علامتوں کے سہارے پیش کرتے ہیں اور ہمیں اس دنیا کی مختلف پوشیدہ حقیقتوں سے واقف کراتے ہیں۔ اس کے متعلق شکیل الرحمٰن یوں لکھتے ہیں:

> ''پہلے ہم رنگ، روشنی، خوشبو اور پیکروں کی لہروں سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے بعد 'سچائی' متاثر کرتی ہے، انسان میں ان سچائیوں کی وجہ سے ایک حساس 'آرگن' (Organ) پیدا ہوا ہے جو روشنی اور رنگ کی لہروں کو محسوس کرتا ہے، اپنے وقت سے دور، روشنی اور رنگ کو محسوس کرتا ہے..... اقبالؔ کی شاعری میں یہ حس بہت بیدار ہے۔'' (شکیل الرحمٰن ''ادب اور جمالیات'' مرتب: شیخ عقیل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۲)

شکیل الرحمٰن ''اقبالؔ کی جمالیات'' میں روشنی کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ اقبالؔ کی شاعرانہ نگاہ کے پس پشت روشنی کا ''آرچ ٹائپ'' حد درجہ متحرک ہے جو اقبالؔ کی نظر و نگاہ کو اس قدر تیز اور طاقت ور بناتا ہے کہ وہ

PDF Compressor Free Version

خارج و باطن کے تمام حدود کو چیر کے نکلتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

گاہ میری نگاہِ تیز ، چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

دل اگر اس خاک میں زندہ ہو بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ

دلوں میں وَلولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

شکیل الرحمٰن کے نزدیک اقبال کے یہاں روشنی کی جمالیات حد درجہ متحرک ہے جس کے عقب میں جذبہ عشق کارفرما ہے۔ ان کی شاعری میں روشنی، رفتار، تپش، گرمی، سرمستی، وجدان، آرزو، جنون یہ ساری کیفیات و خصوصیات ''جذبہ عشق'' کی زائیدہ معلوم ہوتی ہیں عشق کی روشنی میں عرفان ذات و کائنات اور عرفان الٰہیات ممکن ہے۔ موصوف نے اقبال کی تخلیقات میں اس سرچشمہ یعنی ''جذبہ عشق'' کو تلاش کیا جس نے ان کے باطن کو روشن کر کے کائنات الٰہی کی روشنی سے منور کیا ہے جس کے سامنے اس دنیا کے سارے رنگ و خوشبو، رنگ و روشنی اپنے وجود کو بھول کر اسی روشنی کے متلاشی نظر آتے ہیں ۔

آیۂ کائنات کا معنی دیریاب تو
نکلتے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

شکیل الرحمٰن، اقبال کے یہاں جس چیز کی اہمیت پاتے ہیں وہ ''عشق'' ہے جو تمام عناصر پر غالب آتا ہے اور انسان کے اندر صفاتِ الٰہی پیدا کرتا ہے جسے ''دانش نورانی'' اور ''دانش برہانی'' کہتے ہیں۔ عشق سے جو روشنی پیدا ہوتی ہے وہ باطن کی آنکھیں کھول کر پورے عدم و موجود کو عیاں کرتی ہے جس سے عقل کی پہنچ کوسوں دور نظر آتی ہے۔ شکیل صاحب اس روشنی کو عشق کی معراج کہتے ہیں۔ اقبال نے اسے ''انقلاب اندر شعور'' کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

شکیل الرحمٰن، اقبال کے یہاں روشنی کی رفتار نہایت ہی تیز اور بیدار پاتے ہیں۔ یہاں انہیں اقبال کے بنیادی فلسفہ ''خودی'' کے عقب میں بھی روشنی ہی کارفرما نظر آتی ہے، روشنی ہی انسان کے اندر تخلیقی جذبوں کو خلق کرتی ہے جس میں جذبہ ''خودی'' بھی ہے جس کی روح عشق ہے عشق اور خودی دونوں جذبوں کو شکیل الرحمٰن روشنی کی تخلیق تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عشق اور خودی دونوں روشنی کے شدید ترین احساس کی جمالیاتی صورتیں ہیں، جلال و جمال کے پیکر اور اقبالیات کے معنی خیز پیکر! انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے نگاہ اور نظر ان ہی کے معنی خیز پیکر ہیں۔ تنویر عشق اور نور خودی کے پس منظر میں 'نگاہ' اور 'نظر' کے تجربوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ نگاہ اور نظر کی روشنی دراصل عشق اور خودی کی روشنی ہے، جس سے جمالیاتی مسرت اور جمالیاتی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔''

(شکیل الرحمٰن ''ادب اور جمالیات'' ص ۱۳۷)

موصوف اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ باطن کی روشنی سے اقبال کی شاعری میں جو تجربے خلق ہوتے ہیں اور ان تجربوں کو ظہور میں لانے کے لیے الفاظ، تراکیب اور استعارے بھی اسی روشنی کے احساس سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ تجربوں اور آوازوں کو اپنے اندر اس طرح سموئے ہوئے ہیں کہ پڑھ کر قاری بالکل ان آوازوں اور تجربوں کو محسوس کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہر تجربے کی جمالیاتی سطح ادراک نور سے خلق ہوتی ہے۔ اردو کی بوطیقا میں یہ آواز پہلی بار دور سے سنائی دیتی ہوئی اچانک احساس اور جذبے سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔'' (شکیل الرحمٰن ''ادب اور جمالیات'' ص ۱۴۰)

شکیل الرحمٰن، اقبال کے شعری سرمائے میں رنگ کی تلاش کرتے ہیں ان کے یہاں انہیں سرخ رنگ کا عنصر ملتا ہے اور ''لالہ'' کو اس رنگ کی علامت مانتے ہیں۔ شکیل الرحمٰن کو محض اقبال کے کلام میں ہی ''سرخ رنگ'' کا گہرا احساس نہیں ملتا ہے بلکہ ان کا ماننا ہے کہ کئی شعرا کے یہاں سرخ رنگ محبوب کا درجہ رکھتا ہے مثلاً ہومر، تلسی داس، کالی داس، فردوسی،

PDF Compressor Free Version

شیکسپیئر، غالب، ورڈس ورتھ، شیلے، کیٹس اور دیگر کئی شعرا جو مختلف زبانوں سے وابستہ ہیں، ان کے کلام میں سرخ رنگ کا ذکر موجود ہے اقبال کے یہاں شکیل الرحمٰن ''لالہ'' کو سرخ رنگ کی علامت مانتے ہیں گویا دوسرے شعرا کی طرح کلام اقبال میں بھی انہیں رنگ کا واضح عنصر ملتا ہے، اس لیے انہوں نے بڑی گہرائی سے کلام اقبال کا مطالعہ کر کے اور ''لالہ رنگ'' کی مختلف معنوی جہات کو تلاش کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ کس طرح اقبال نے مختلف اوقات میں ''لالہ'' کا استعمال مختلف معنوں میں کیا ہے۔ شکیل الرحمٰن اقبال کی شاعری میں ''لالہ'' کے مختلف معنوں کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ''لالہ طور (پیام مشرق) کی رباعیوں تک اس کی صورت تہذیب حجاز اور امت محمدی کی علامت کی ہو جاتی ہے ایک سو باسٹھ رباعیوں میں اس کا رنگ اپنی جگہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ پھول ایک بڑی تہہ دار، حسین تر اور اعلیٰ ترین اقدار کی محافظ تہذیب کا علامیہ ہے..... آتش لالہ میں کشمیر نظر آتا ہے، وہ کشمیر کے جذبات اور احساسات کی تصویر بن جاتا ہے۔ 'ارمغان حجاز' کی نویں نظم میں 'لالۂ آتشیں پیرہن، عاشق کے دل کی علامت ہے..... لالہ کبھی کشمیری نوجوان کی علامت ('ارمغان حجاز' کی سولہویں نظم) لہو کی علامت بن کر ابھرتا ہے اور کبھی حسن ازل کی علامت (کوشش ناتمام) کبھی عرب کی تہذیب کا استعارہ بنتا ہے اور کبھی خود اقبال کے نفس کی آگ کی علامت۔ ظاہر ہے صرف اس کا رنگ شاعری کی توجہ کا مرکز نہیں ہے۔ آخری دور میں جب اقبال اسے کائنات کی تسخیر کا ذریعہ اور ایک بڑی تہذیب کی علامت بناتے ہیں تو وہ رنگ کے پیکر سے زیادہ روشنی کا پیکر بن جاتا ہے۔ ایک روشن تہذیب کا علامیہ اور عشق کی روشنی کا استعارہ اس مصرعے میں۔

> پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن

(شکیل الرحمٰن ''ادب اور جمالیات'' ص ۱۴۵)

شکیل الرحمٰن، اقبال کی شاعری میں مجسم پیکروں یعنی پہاڑ، ندی، برف، دریا، غنچہ گل، کوہسار اور دیگر پیکروں سے زیادہ روشنی کے پیکر متحرک پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک فنکار (اقبال) فطرت کے ساتھ ایک باطنی رشتہ قائم کر کے نئے آہنگ کو خلق کرتے ہیں اور اس آہنگ کے ذریعہ فطرت کو اپنے جلال و جمال کے ساتھ اپنے اندر سمو کر اپنے وجود کے اندر روشنی پیدا کر کے ان نظموں کی تخلیق کرتے ہیں جن میں روشنی کا بھرپور احساس موجود ہے۔ ''آفتاب''، ''صبح آفتاب''، ''ماہ نو''، ''پیام صبح''، ''چاند''، ''جگنو''، ''صبح کا تارہ''، ''ایک پرندہ'' اور ''جگنو''، ''چاند اور تارے''، ''دوستارے''، ''چاند''، ''بزم انجم''، ''شمع اور شاعر''، ''نوید صبح''، ''شعاع امید'' اور دیگر کئی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے ''روشنی کی جمالیات'' کا بھرپور ادراک ہوتا ہے۔

''محمد اقبال'' گیارہ مضامین پر مشتمل اقبال کے متعلق شکیل الرحمٰن کی دوسری تصنیف ہے جسے ''روشنی کی جمالیات'' کا دوسرا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اس حصے میں موصوف نے اقبال کی شاعری کے گوناگوں پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں شکیل الرحمٰن نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اقبال نے جہاں مذہبی، سماجی اور اقتصادی علوم پر غور و فکر کیا وہیں ان کے تجزیاتی و فلسفیانہ ذہن میں فنون لطیفہ کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے اور وہ ایسے فن یا آرٹ کی تخلیق چاہتے ہیں جو ہمارے اندر روح پھونکے، اندرون جگادے اور یہ تب ممکن ہے جب فنکار میں عشق، جنوں، نگاہ ذوق اور خودی کا جذبہ نس نس میں رچا بسا ہو۔

شکیل الرحمٰن آرٹ یا فن کو تخلیقی عمل کے زمرے میں ہی شامل کرتے ہیں جس کے ذریعہ فنکار اپنے تصورات، خیالات، احساسات کا اظہار حسین اور دلکش انداز میں کرتا ہے کچھ فن کار اپنے فن کا اظہار شاعری کے ذریعہ کرتے ہیں۔ کچھ موسیقی کے ذریعہ تو کچھ سنگتراشی یا مصوری کے روپ میں بغیر کسی مذہب وملت، رنگ و نسل کے اظہار فن کرتے ہوئے ''انسان دوستی'' کی مثالیں قائم کر لیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں انسان دوستی اور اعلیٰ اقدار کی پاسداری پاتے ہوئے شکیل الرحمٰن انہیں ایک بڑا انسان دوست فن کار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

PDF Compressor Free Version

''ان کی 'ہیومنزم' ماضی کی اعلیٰ روایات، انسان کے پورے سفر کی بصیرت، اسلام کی تیز تر روشنی، یورپ کے افکار وخیالات کی معانی خیزی اور اشیاء کی تہذیبی روایات کے جادو کا خوبصورت نتیجہ ہے۔ سترہویں صدی کی ہوش مندی، اٹھارہویں صدی کی عقل پسندی، انیسویں صدی کے تجربوں کی کشادگی، بیسویں صدی کی آرزوؤں کے درد اور انسانی معاشرے کی شکست و ریخت سے ان کے ذہن کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ 'صاحب نظرے'، 'خود گرے'، 'خود شکنے'، 'خود نگرے' کا شدید تر احساس جو ان کی شاعری سے ابھرا ہے وہ اسی شعور اور انسان دوستی یا 'ہیومنزم' کے ہمہ گیر تصور کا نتیجہ ہے۔'' (شکیل الرحمٰن ''محمد اقبال'' موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۱۱)

شکیل الرحمٰن، اقبال کی شاعری کا مطالعہ کر کے ان کے بنیادی فلسفہ عشق اور خودی کو جمالیاتی تصور کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ خودی اور عشق ہی حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ اس قسم کی دریافت اردو شاعری میں غیر معمولی دریافت ہے، کیونکہ عشق ہی حسن کی تلاش کرتا ہے اور حسن کی وحدت بھی عشق ہی سے قائم رہتی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن، نگاہ، جنوں، شوق، معنی خیز تجربات، جذبات کا مکمل اظہار، الفاظ کا نیا برتاؤ اور سحر انگیز انداز بیان جذبہ عشق ہی کی دین ہے۔

شکیل الرحمٰن، اقبال کے یہاں وژن نہایت ہی بیدار اور وسیع پاتے ہیں جس کی کشادگی اور وسعت کا سب سے بڑا محرک اسلامی افکار اور مطالعہ قرآن ہی ہے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان کی 'مثالیت پسندی' رومانی تصوریت میں تاریخ اسلام اور مطالعہ اسلام سے وہ تازگی آئی ہے جس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔''

(شکیل الرحمٰن ''محمد اقبال'' ص ۲۶)

شکیل الرحمٰن، اقبال کی شعری تخلیقات میں موسیقی کو خاصا اہم پاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ وہ اس موسیقی کے خواہاں ہیں جو سوز و گداز سے پر ہو، معنی خیز ہو، ضمیر کو بیدار کرنے والی ہو، باطن میں روشنی پیدا کرنے والی اور دل میں تلاطم پیدا کرنے والی ہو۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کہ وہ نغمہ سرمدی خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موج نفس سے زیر و بالا
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

شکیل الرحمٰن نے اس بات کا انکشاف کیا کہ اقبال دوسرے علوم و فنون کی طرح مصوری و فن تعمیر کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور ان فنون کو جاندار بنانے کے حق میں ہیں، کیونکہ روح کو بیدار کرنے، اندرون کو جگانے میں ان فنون کا خاصا رول ہے۔ مصوری کے لیے اقبال تن آسانی، خود فراموشی، کم ہمتی و پس حوصلے کو مصوری کی موت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مصور کو ایک زندہ جاوید تصویر پیش کرنے کے لیے اپنے آپ میں حوصلہ، ہمت، زندہ دلی، خلوص، خودی، جنون اور جذبہ عشق پیدا کرنا چاہیے۔ فن مصوری کی طرح شکیل الرحمٰن، اقبال کے یہاں فن تعمیر کو بھی خاصا اہم پاتے ہیں۔ فن تعمیر سے اقبال بے حد متاثر نظر آتے ہیں اور ان تعمیرات میں ایسے فنکاروں کے عشق کو خوب سراہتے ہیں، جنہوں نے ان تعمیرات کے خواب دیکھ کر انہیں حقیقی صورت میں لانے کے لیے اپنے خون جگر سے ان کی تخلیق کر کے زندہ مثالیں قائم کی ہیں۔ اس حوالے سے شکیل الرحمٰن یوں رقم طراز ہیں:

''اقبال کی نگاہیں عمارتوں میں ان کی شخصیتوں کو محسوس کرتی ہیں جنہوں نے ان عمارتوں کی تعمیر کے خواب دیکھے تھے۔ ان کے کردار کی خوبیاں پتھر دل میں جذب ہیں۔ اسلاف کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوگا کہ عہد، وقت یا زمانہ ستونوں میں جم کر رہ گیا ہے ان عمارتوں کا مزاج' ان کی روحانی کیفیت اور ان کی شخصیتیں دوسرے فن کاروں کے اندر اضطراب پیدا کر دیتی ہیں..... 'تاج محل' کو دیکھتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ عشق نے سنگ مرمر پر اپنی داستان لکھ

PDF Compressor Free Version

دی ہے..... 'مسجد قرطبہ' میں 'خون جگر' خاکی اور نوری صفات اور تخلیق کے کرب اور شخصیت اور پورے وجود کے فنکارانہ اظہار کی معانی خیز علامت ہے۔"

(شکیل الرحمٰن "محمد اقبال" ص ۳۶ و ص ۳۷)

شکیل الرحمٰن، اقبال کی شاعری کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے اس کے اندر استعاروں، امیجز اور علامتوں کا جو سرمایہ پوشیدہ ہے اس کو آشکار کرتے ہوئے اقبال کے افکار و خیالات اور دیگر متعدد پہلوؤں کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ موصوف اس بات کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ اقبال کے شعری تجربوں میں کلاسیکیت و رومانیت کے ساتھ ساتھ نئے نئے پیکروں، استعاروں، امیجز اور علامتوں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے جس نے اقبال کی تخلیقات میں ایک نئی دنیا کو خلق کیا۔

شکیل الرحمٰن، اقبال کی خطیبانہ شاعری میں جمالیات کو تلاش کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ تخلیقی ادب ہمیشہ اور ہر عہد میں اپنی خطیبانہ جہت کے ساتھ نمایاں رہا ہے اور اقبال کی شاعری میں یہ جہت نہایت ہی تابناک دکھائی دیتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے اقبال کی شاعری میں خطیبانہ جہت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے پورے ادب میں خطیبانہ ادب کی روایت و اہمیت اور مختلف جہات کا بھر پور احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اقبال کی شاعری میں انہیں جو خطیبانہ جہت ملتی ہے وہ ان کے بنیادی رجحانات سے ہی پیدا ہوتی ہے جو ایک قوت کے ساتھ فن کار کے بنیادی آہنگ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مناسب الفاظ و استعاروں کو تراش کر ایک نئے ڈکشن کو خلق کرتی ہے جس سے ان کی خطیبانہ شاعری کی جمالیاتی جہت نے بھی اپنا ایک منفرد معیار قائم کیا ہے۔ شکیل الرحمٰن کو ان کی شاعری میں خطیبانہ جہت کو جانچتے ہوئے اس کی جڑیں اسلامی تہذیب کی روایت میں پیوست نظر آتی ہیں، اس لیے وہ لکھتے ہیں:

"ان کا فلسفیانہ ذہن اپنے ماضی کے فلسفوں کو جانتا پہچانتا ہے اور ان سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ ان کے کلام کی خطیبانہ جہت میں نور اور تحرک کے صدیوں کے تجربات کی روشنی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے اردو شاعری اور فارسی کلام میں پہلی بار شاعری کی خطیبانہ جہت کی جمالیاتی اقدار کی نئی تشکیل کی ہے۔"

(شکیل الرحمٰن "محمد اقبال" ص ۱۱۵)

مختصراً یہ کہ شکیل الرحمٰن نے "اقبال روشنی کی جمالیات"، "محمد اقبال" جیسی تصانیف لکھ کر اقبال شناسی کو نیا رخ دیا۔ یہ کتابیں اقبالیات میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں شکیل الرحمٰن نے کلام اقبال کا جائزہ لے کر ان کے نظام فکر و فن میں جمالیاتی شعور کو واضح کیا ہے۔

❁❁❁

تفہیم جمالیات کا ایک..... (ص ۲۹ سے آگے)

رنگا رنگی پنہاں ہے۔

اثر آبلہ سے جادہ صحرائے جنوں
صورت رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

نہ پوچھ وسعت میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں بہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز

جوشِ جنوں ہے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشت خاک ہے

ہے جنوں، اہل جنوں کے لئے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کتاب میں مشمولہ سولہ مضامین فکر و مطالعے کے سولہ ابواب کھولتے ہیں۔ اگر ہر ایک پر گفتگو کی جائے تو ایک مکمل کتاب تیار ہو جائے گی۔ اس لئے درازیٔ سخن سے احتراز کرتے ہوئے شکیل صاحب کے اس فکر انگیز ریمارک پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

"تصوف کے جمال کا مطالعہ زندگی کی انگنت خوبصورت سچائیوں کا مطالعہ ہے۔"

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

خراج منظوم

مرتضیٰ اظہر رضوی
دربھنگہ (بہار)

نئے عہد کا منصور

(یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی جب شکیل الرحمٰن دربھنگہ سے وی سی کے عہدے کو چھوڑ کر جا رہے تھے)

جرم اظہار حقیقت کا سزاوار گیا — شہر سے میرے سوا کون گنہگار گیا
لے کے دل میں طرب گرمیٔ بازار گیا — کتنا آسودہ ضمیروں کا خریدار گیا
کہہ دو لوگوں سے کہ اب کھولیں دکاں چہروں کی — وہ جو تھا شہر میں اک صاحب کردار گیا
لوگ کہتے ہیں نئے عہد کا منصور ہے وہ — کوچہ یار سے نکلا تو سر دار گیا
آج پھر سنت سقراط ہے زندہ اس سے — دے کے احساس کو اک گرمیٔ پیکار گیا
فکر کے شہر میں بیدار ہوا سوز ضمیر — اجنبی دے کے اذاں اک سر دیوار گیا
لب کشائی کا صلہ زہر کا ساغر ہی سہی — خلق کو دے کے مگر جرأت اظہار گیا
چاک در چاک ہے لیلیٰ سیاست کا نقاب — اس کے زر ہفت گریبان کا ہر تار گیا
جب بچھی بزم سیاست میں صداقت کی بساط — دل دیوانہ جوا کھیل گیا ، ہار گیا
ہار کو جیت کا اعلان بنانے والا — چھیڑ کر زمزمہ حق سر بازار گیا
سر بہ زانو ہے ہر اک ریشہ دوانی کا فسوں — سر مغرور سے کب رتبہ پندار گیا
دھولے(۱) چہرے کی سیاہی میرے صوبے کا رئیس — حسن تقریر گیا ، جوہر گفتار گیا
''میری آواز جو پلٹے گی تو ڈس لے گی تمہیں'' — کر کے اعلان ، نئے ذہن کا معمار گیا
وہ کہ سچائی پہ تھا ہار بھی ہے جیت اس کی — سر سودائے وزارت(۲) کا جنوں ہار گیا

دل اظہر میں کچھ اس طرح اٹھی یاد شکیل(۳)
ذہن شاعر طرف فکر گہر بار گیا

❁❁❁

(۱) بھاگوت جھا آزاد (۲) ناگندر جھا (۳) شکیل الرحمٰن وائس چانسلر (سابق) متھلا یونیورسٹی

PDF Compressor Free Version

پروفیسر عبدالمنان طرزی

Mohalla Faizullah Khan, Darbhanga

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن: نقیب جمالیات

اب شکیل الرحمٰن پہ لکھنے کی ساعت آئی ہے
دل نے اپنے فرض ہی کی راہ بھی دکھلائی ہے

نام یہ اردو ادب میں ہے بلاشبہ عظیم
وہ جمالیات کی پھیلائی انہوں نے شمیم

آپ سے اردو ادب نے پائی ہے دولت گراں
شہریارِ شہر تنقیدات ہیں وہ بے گماں

علم و دانش کے گراں لائے دفاتر آپ ہی
نقد فن میں ہیں جمالیات ماہر آپ ہی

اردو کے نقادوں میں تو ہیں ہی وہ اعلیٰ مقام
منفرد ٹھہرا جمالیات ہی سے ان کا نام

اک دبستاں نقد کا جیسے یہ پیدا کر گئے
منتظر تھا میکدہ وہ آئے ، ساغر بھر گئے

آپ نے اردو کو گر ، تو آپ کو اس نے دیا
ہاں مگر اتنا نہیں جتنا کہ حق تھا آپ کا

کیا دیا اور کیا ملا ، خاطر میں لانے کا نہیں
اس بنا پر ہی ہوئے بھی آپ جب عظمت نشیں

ایسے خامے کی جمال آرائی کچھ دکھلا گئے
ماند جس سے پڑ گئے جلوے بت طناز کے

آپ ہیں میخانۂ اردو کے وہ پیرِ مغاں
پاتے ہیں جامِ جمالیات جن سے میکشاں

گیسوئے اردو میں کی یوں آپ نے مشاطگی
کوئی پاجائے قیامت خیز جیسے مہوشی

ساقیِ میخانہ کی صورت میں یہ بالا قدی
وسعت علمی صرف حاصل نہیں کہلائے گی

وسعت علمی کا وافر حصہ اس میں ہے ضرور
ہے محرک اختراعی اور خلاقی شعور

ہے نگاہِ متجسس ہی کا یہ اعجاز بھی
اک اُفق تازہ ، جمالیات کی جو ڈھونڈ لی

اس اُفق کی رنگ آرائی ہے ایسی معنی خیز
پیرہن محبوب کا ہوتا ہے جیسے عطر بیز

شیخ کے سجادے کی جیسے طہارت معتبر
جیسے غالبؔ کے سخن کی معنویت معتبر

اس طرح لیتے عوامل اختراعی سے وہ کام
بن گئے ہیں آپ اپنی طرز کے موجد، امام

آپ کا اسلوبِ تنقیدی ہے وہ جوئے نشاط
موجزن جس میں ہے آبِ حظ و کیف انبساط

ہو جمالیات کا اطلاق جب تنقید پر
کیوں کسی معشوق کی موہوم ٹھہرے بھی کمر

شمع روشن جس طرح طاقِ حرم میں ہو کوئی
جس طرح وادی میں چادر زعفرانی ہو بچھی

میکدے میں جس طرح تشنہ لبوں کا قافلہ
جیسے دو فرقت زدہ کے درمیاں ہو فاصلہ

خلق اک ایسے اُفق کی ہے بھلا آسان کیا
کتنا رفعت آشنا ہے حوصلہ موصوف کا

PDF Compressor Free Version

کشورِ تنقید کی زیبا ہے اُن کو خوش روی
پائی وجدانِ جمالیات ہی سے سروری

پاتے ہیں ان کے یہاں ہم ایسے جملے خوب ہی
کتنی غزلوں کی ہے جس سے آبرو بھی لٹ گئی

''شاعریٔ میر کا ہے عشق نقطہ مرکزی
عشق ہی کی کارفرمائی ہے اس کی شاعری''

''ہے جو رجحان نشاطی میر خسرو کے یہاں
وہ جمالیات کا اس کے ہے محکم ترجماں''

ان کے اندازِ دعاوی میں جو استحکام ہے
جلوہ خود ہی جیسے کوئی برکنارِ بام ہے

وصف یہ ان کی نگارش کا یقیناً ہے بڑا
چھوٹے جملوں میں جہانِ معنی ہوتا ہے چھپا

''ہے مغل تہذیب ہندی کی جمالیات ہی
اور اسی تہذیب کی تہہ داری و تابندگی

اس نے ہی تشکیل ذہنی مرزا غالبؔ کی ہے کی
فن غالبؔ جس کی بے شبہ علامت ہے بڑی

شاعری میں آئے گا جب حسی لذت کا بیاں
نام غالبؔ کا زباں پر آئے گا ہی بے گماں''

''رومی بے شبہ بڑے شاعر ہیں حسیات کے
اور اسی میں جذب بھی فکر گراں کو کر گئے

استعاروں، لفظوں، تشبیہوں کی کہیے تازگی
اور تخلیقوں میں پرکاری، نفاست، سادگی

سب کا حسیات پر بتلاتے اظہارِ کمال
ادّعائے انتقادی کی یہ ہے اُن کے مثال''

ہے بنا تنقید کی حسی جمالیات ہی
وہ اسی کی ڈھونڈتے تخلیق میں جلوہ گری

ان کا فن آہنگ تخلیقی میں آہنگ وجود
ہے شکیل الرحمٰن کے تنقید کی اس میں نمود

جو شعور و ذہن و باطن میں چراغاں کر گئی
کارفرمائی ہے کچھ اُن کی جمالیات کی

تجربوں کی دولت وافر بھی ہے اُن کے یہاں
مختلف تہذیبی سورج کی شعاع بیکراں

اُن کی تخلیقات قاری کا ہیں وہ گنج گراں
جس سے حاصل انبساطِ ذہنی ہوتی بے گماں

رشتہ بابا سائیں کا جو ہے جمالیات سے
جس طرح پیشِ نظر جلوے ہوں کائنات کے

منظر بو قلموں سے ہے نظر جو حیرتی
اس سے حاصل ہے تجسس انساں کی پونجی بڑی

جو جمالیاتی پس منظر میں ہے دریافت بھی
انفرادِ فن بھی ہے وہ انفرادِ ذات بھی

ایسی دولت اردو کو اب تک کسی نے دی نہیں
ان کا ہے وہ، جس پہ اوروں نے نظر ڈالی نہیں

وسعت علمی کی ہو یا رفعت فکری کی بات
منفرد، ممتاز آتی ہے نظر بس اِن کی ذات

آپ کی دریافت کا کچھ منصفانہ جائزہ
ناقدین اردو سے شاید نہیں ہے آ سکا

اختلاف اُن سے نظریاتی تو ہوسکتا ہے بھی
رائے اس کے بارے میں کوئی مدلل لائے بھی

وقت منصف ہے بڑا یہ اک حقیقت ہے بڑی
وقت آئے گا، گراں دولت یہ مانی جائے گی

روزِ محشر سرخروئی ہو میسر آپ کو
اپنی رحمت سے نوازے ربِّ اکبر آپ کو

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

کہکشاں تبسم

C/o Ziyaul Islam Rizvi, Sabur College Sabur,
Bhagalpur 813210 (Mob. 5651449489)

صدائے آشرم

کہاں ہو تم؟
کھلی باہیں بلاتی ہیں دروں کی
سراپا ڈھونڈتی رہتیں نگاہیں آشرم کی
کواڑوں پر لٹکتے قفل زنگ آلود ہیں، لیکن
چھپائے اپنے اندر ہیں خزانے بیتی یادوں کے
دریچے آج بھی سرگوشیاں کرتے
وہیں سیڑھی پہ اب بھی اک سراپا نور کا مشعل دکھاتا ہے
چلے آؤ..... کہاں ہو تم؟
ذرا دیکھو تو آ کر اس کھلی چھت کو
تمہاری آہٹوں کی منتظر ہے، مضطرب سی ہے
جہاں اب بھی تمہاری قرأتوں کے سر
ہوا میں گونجتے ہیں
وہیں بچوں کی ہیں کلکاریوں کی بازگشت اب بھی
غبار آلود ہے یہ آئینہ خانہ
بلاتا ہے تمہیں کہ گرد پونچھو نرم ہاتھوں سے
سجاؤ پہلے جیسا پھر
کرو آباد اپنی گرم سانسوں سے
کہ جی اٹھیں سنہرے پل
بدل جائے اداسی کا یہاں ٹھہرا ہوا منظر
صدائے آشرم اب سر پٹکتی ہے
شکیل..... آؤ..... کہاں ہو تم؟

❁❁❁

حیدر وارثی

Jadid Warsi Hawaili, Taleem Nagar
Bibi Pakar, Darbhanga (Mob. 7277803486)

ماہر جمالیات: شکیل الرحمٰن

کون ہوگا مثل تیرے اب ماہر جمالیات شکیل
تو قلم کاروں میں رہا اہل کمالات شکیل
کتنے غنچے کھلائے علم و ہنر کے تو نے
گویا روشن ہی کیا تو نے چراغ ادبیات شکیل
میں کروں کس سے رجوع اے دوست! تیرے بعد اب
کہ رہا کوئی کہاں میری بازیافت شکیل
باتوں باتوں میں پڑھایا تو نے معرفت کا سبق
کون لکھے گا اب ایسی حکایات شکیل
کر دیا تو نے اجاگر پہلے تصوف کا جمال
پھر بنا تو ''بابا سائیں'' کی تشکیلات شکیل
نور ہی نور برسایا علم و ادب میں تو نے
جب کیا تحریر تو نے ''غالب کی جمالیات'' شکیل
تو بھٹکتا ہی رہا کوچہ سیاست میں فضول
رب نے تو بنایا تجھے ماہر تعلیمات شکیل
لکھ دیا تو نے کبھی ''بارہ ماسوں کا جمال''
تو نے کیا کیا نہ کیا گویا طلسمات شکیل
زندگی تیری تو گزری کرب و الم میں ضرور
تو نے پائے مگر خوشیوں کے بھی لمحات شکیل
یاد آتی ہے تری تو آتا ہے کلیجہ منھ کو
پائے گا فردوس میں تو مقامات شکیل

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شکیل الرحمٰن

تبرکات شکیل

جمالیات

''منطق'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہیگل نے کہا تھا کہ پہلے ہی بتا دینا کہ منطق کیا ہے ممکن نہیں ہے، جب تک ہم اس کی پوری وضاحت کر کے اس کے خدوخال نہیں ابھاریں گے اور مکمل آگاہی حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک اس بات کا علم ممکن نہیں کہ منطق کیا ہے۔

''جمالیات'' کے تعلق سے بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے ''جمالیات'' اور اس کے بنیادی موضوع کے متعلق ہم اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس کا علم حاصل نہ ہو جائے اور اس کے جوہر کی پہچان نہ ہو جائے، بڑی معنی خیز، تہہ دار اصطلاحوں کی تشریحیں اور تفسیریں ہو سکتی ہیں اور صرف تشریحوں اور تفسیروں ہی سے ان کے مفاہیم کو سمجھا جاسکتا ہے، فنون کی اصطلاحیں سائنسی اصطلاحوں کی طرح ٹھوس اور صرف خاص رُخ کو پیش کرنے والی اصطلاحیں نہیں ہوتیں۔

جمالیات کی ایک بڑی تاریخ ہے، ارتقائی منزلوں کو طے کرتے ہوئے جانے کتنے تصورات پیدا ہوئے ہیں، تصورات تبدیل ہوئے ہیں، مختلف تصورات میں مفاہیم کی نئی جہتیں پیدا ہوئی ہیں۔ خود جمالیات نے جانے کتنی اصطلاحوں کو خلق کیا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ جب ایسی صورت ہے تو ظاہر ہے جمالیات کے اندر سے پھوٹے ہوئے سوالات میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمالیات کی کوئی ایک تعریف نہیں ہو سکتی، اس کی مختلف تشریحوں سے اس کے ایک سے زیادہ پہلوؤں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ معنی خیز ادبی اور فنی اصطلاحوں کا حسن تو یہی ہے، بعض ادبی اور فنی اصطلاحیں غالب کی اصطلاح میں ''چراغاں'' کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور جانے کتنے مناظر کے ساتھ ''تماشا'' بن جاتی ہیں۔

یونانی فلسفیوں خصوصاً فیثا غورث وغیرہ نے جمالیات کو فلسفے کا ایک پہلو قرار دیا تھا۔ ارسطو نے اسے حسن، حسن کی فطرت و ماہیت اور فنون لطیفہ سے قریب تر کیا اور فنکارانہ تجربے کو جمالیاتی تجربہ سمجھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی منزل سے جمالیات کے باطن سے ایسے سوالات پھوٹنے اور ابھرنے لگے کہ جن کا تعلق حسن، حسن کی ماہیت اور تخلیقی عمل اور فنون لطیفہ کے جوہر سے تھا، حالانکہ اس سے قبل سقراط نے اسے صرف اخلاقیات سے وابستہ کر رکھا تھا اور افلاطون نے اپنی ''ری پبلک'' کے اچھے شہریوں کے لئے اسے علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا تھا، لیونارڈو نے فطرت کے جلال و جمال اور فنون کے رشتوں کو سمجھنے کے لئے ''جمالیات'' کا سہارا لیا۔ بوآئیلو (Boileau) نے تخلیقی فن کے معیار کے لئے ''جمالیات'' کو عزیز جانا، بام گارٹن (Baumgarten) نے آرٹ کے ذریعہ دنیا کے حسن کو پانے اور فنکار اور حیات و کائنات کے حسی رشتوں کو سمجھنے میں اس کی مدد لی۔ ہیگل نے اسے زندگی اور آرٹ کے حسن کو سمجھنے کا ذریعہ جانا اور کائنات کی روح کے عمل اور تخلیقی آرٹ کی جگہ تلاش کرتے ہوئے جمالیات کو بڑا ذریعہ سمجھا۔ نووالس (Novalis) نے رومانیت کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے فنکار کے منفرد جمالیاتی رویے کو اہمیت دی، چرنی شوسکی (Chernyshaisky) نے انسان اور وجود کے رشتے کو سمجھنے کے لئے تمام جمالیاتی کیفیتوں اور رشتوں کو غیر معمولی اہمیت دی۔ بلنسی (Belinsky) نے جمالیات کو ''فنی صداقت'' اور حقیقت کو سمجھنے کا ایک بڑا ذریعہ بتایا۔ کسی نے کہا کہ سماجی تبدیلیوں اور نظام زندگی کی تبدیلی سے جمالیاتی قدریں تبدیل ہو جاتی ہیں، لہٰذا حسن کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا رویہ بھی بدل جاتا ہے۔ کسی نے یہ بتایا کہ حسن قدر نہیں جبلت ہے اور جبلت تبدیل نہیں ہوتی۔ قدروں کی تبدیلی سے حسن کو دیکھنے، اسے محسوس کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا انداز بظاہر جتنا بھی بدل جائے، بنیادی طور پر کوئی

PDF Compressor Free Version

تبدیلی نہیں ہوتی۔ایک دبستان اس طرح سوچتا ہے کہ جمالیات فرد کے باطن کا معاملہ ہے تخلیقی عمل میں باطنی جمالیاتی تجربے یقیناً اہم ہیں،لیکن وہ تجربے خارجی جمالیاتی قدروں کی دین ہیں۔

ظاہر ہے ایسی صورت میں ''جمالیات'' کی تعریف ممکن نہیں ہے، جمالیات کے تعلق سے یہ تشریحیں، تعبیریں اور تفسیریں اہمیت رکھتی ہیں، ان تصورات کے علاوہ دوسرے جانے کتنے تصورات موجود ہیں کہ جن کی اہمیت ہے۔یہ سب جمالیات کی مختلف جہتوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ ہر خیال اور ہر تصور میں کوئی نہ کوئی سچائی موجود ہے، ایسے سینکڑوں تصورات سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ جمالیات کی اصطلاح ایک انتہائی معنی غیر معمولی اصطلاح ہے اور فنون لطیفہ میں اس کی معنویت اپنی تہہ داری کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ فنون لطیفہ جمالیات کی دین ہے، جمالیات ہی تجربہ کو فنی تجربہ بناتی ہے، جمالیاتی فکر ونظر ہی سے تخلیق ہوتی ہے۔جمالیات ہی سے فنکار کے ''وژن'' میں کشادگی پیدا ہوتی ہے، اس سے فنون لطیفہ میں جلال و جمال کا ایک نظام قائم ہوتا ہے۔

فن وادب کی تنقید تو بنیادی طور پر جمالیاتی ہوتی ہے۔ناقد اور فنکار کے جمالیاتی شعور سے رشتہ قائم ہوتا ہے تو فنکار کا سچا جوہر سامنے آتا ہے، فنکار تو اپنے جلال و جمال کے مظاہر ہی پیش کرتا ہے اور ان مظاہر کو محسوس کرنے اور ان کی وضاحت وتشریح کرنے کے لئے ناقد کو اپنے جمالیاتی شعور ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔زبان وادب کا معاملہ ایسا ہے کہ اساطیری، مذہبی، صوفیانہ، فکری، سائنسی، طبی غرض ہر قسم کی اصطلاحیں جذب ہوجاتی ہیں، شرط یہ ہے کہ ان اصطلاحوں میں جمالیاتی جہتوں کی نشاندہی اور تخلیق کے جلوؤں اور فنکار کی شخصیت کے رموز کی نقاب کشائی کرنے کی صلاحیت موجود ہو، ایسی اصطلاحیں جو ان کارناموں کو انجام دینے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں وہ فنی اور جمالیاتی معنویت کو واضح کرتی ہیں اور اکثر اپنی تہہ دار اور پہلودار خصوصیتوں سے قاری کے ذہن کو فن کی عظمت اور بزرگی اور جمالیاتی جہتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ جمالیاتی انبساط پانے میں مدد کرتی ہیں، فن وادب کی اپنی اصطلاحیں سماجیات، عمرانیات، معاشیات، نفسیات اور اساطیر و مذاہب کے مقابلے میں بہت کم ہیں، ہوتا یہ ہے کہ مختلف علوم سے اصطلاحیں حاصل ہوتی رہتی ہیں اور ادبی اقدار کی جمالیاتی وضاحت وتشریح اور تجزیے کے قابل ہوتی ہیں تو وہ ادبی اور فنی اصطلاحوں کی صورتیں اختیار کرلیتی ہیں۔

بام گارٹن (۱۷۱۴ء-۱۷۶۲ء) نے سب سے پہلے فلسفہ حسن کے لئے Aesthetics کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ یہ فلسفے کا ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے اس اصطلاح کا ماخذ یونانی لفظ Aisthetikos ہے۔اس کے معنی ایسی شے کے ہیں کہ جس کا ادراک حواس کے ذریعہ ہو۔بام گارٹن نے اس میں احساس اور ادراک دونوں کو اہمیت دی اور اسے ایک علم سے تعبیر کیا، جمالیات کی تاریخ اپنے نام سے زیادہ قدیم ہے، قدیم ترین علما نے حسن، فن اور فنی صداقت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، یونانی جمالیات اور ہندوستانی جمالیات کی اپنی تہہ دار تاریخ ہے، ہندوستان کے قدیم اچاریوں نے ''بھو'' یعنی ذہنی کیفیات، ''رس'' یعنی جلال و جمال کے عرفان کا جوہر، جمالیاتی تجربوں کی فنی ترسیل کی خوشبو اور جمالیاتی انبساط یا ''آنند کا جادو'' آہنگ اور آہنگ کی وحدت اور ''النکار'' یعنی اظہار کے حسن وغیرہ پر جس شدت سے اظہار خیال کیا ہے جمالیات کی تاریخ میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

اس ادبی اصطلاح کی معنویت پھیلتی جارہی ہے اور اس کی نئی جہتیں نمایاں ہوتی جارہی ہیں، تاریخی جوہر دل سے معمور انسانی اقدار، فنکاروں کی تخلیقات، احساس و ادراک، کائنات کے جلال و جمال کے مظاہر، شعور وعرفان، آسودگی اور انبساط، پیکر تراشی، آواز اور اس کی گونج، اشاراتی مفاہیم، رمزیت واشاریت، ڈرامائی خصوصیات، فضا آفرینی، سچائی کی صورت کی تبدیلی، شعوری اور لاشعوری کیفیات، خارجی اور باطنی تحرکات کی وحدت، تخلیقی عمل کی پراسرار کیفیتیں، تخیل اور وژن، تجربوں کا حسن اور تخلیق یا کلام کی آرائش وزیبائش، سب اس کے دائرے اور اس کی گرفت میں ہیں، جمالیات کی مدد کے بغیر فنون لطیفہ کا مطالعہ ہی ممکن نہیں ہے۔جمالیات تو فنون کی روح ہے۔اس اصطلاح کا سب سے صاف اور واضح مفہوم یہ ہے کہ فنکار کے جمالیاتی شعور نے حیات وکائنات کے جلال و جمال سے کس سطح پر اور کس نوعیت کا تخلیقی رشتہ قائم کیا ہے اور جو تخلیق سامنے آئی ہے اس کا حسن کیا ہے، کیسا ہے۔

PDF Compressor Free Version

ایسی دریافت سے جہاں سماج کے جمالیاتی مزاج اور رجحان کی پہچان ہوتی ہے وہاں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ فنکار کے جمالیاتی تجربوں نے سوسائٹی کے باطن میں کس نوعیت کا تحرک پیدا کیا ہے، کبھی کبھیتو فنکاروں کے ایسے تجربوں کے تحرک سے سماج کا مزاج ہی بدل جاتا ہے۔ رجحان اور رویے میں تبدیلی آجاتی ہے، ہندوستان کی مجسمہ سازی کی تاریخ اس کی عمدہ مثال ہے۔

جمالیات کا تعلق انسان اور اس کے سماج سے ہے انسان کے حواس خمسہ سے ہے، اس کے شعور اور لاشعور سے ہے، وہ عمر بھر حسن کی تلاش میں مصروف سفر رہا ہے، خالق کائنات کا حسن ہو یا سماجی زندگی کا، اپنی ذات کا حسن ہو یا دوسرے افراد کا، حیات و کائنات کا حسن ہو یا فطرت کے جلال و جمال کا، زندگی کا حسن ہو یا موت کا۔ فنون لطیفہ میں تو اسی کے تجربے پیش کئے ہوئے ہیں۔ وہ تری مورتی ہو یا نٹ راج، وینس کا پیکر ہو یا بدھ کا مجسمہ، تاج محل، اجنٹا اور ایلورا ہو یا حافظ، کبیر اور غالب، ڈیوائن کامیڈی، میک بتھ اور شاہنامہ فردوسی ہو یا مجمی اور مغل آرٹ۔

افسوس کی بات ہے کہ اب بھی جمالیات کا ذکر آتا ہے تو بعض حضرات اسے علم سماجیات یا علم عمرانیات یا علم نفسیات کی طرح تاریخی تسلسل میں صرف چند علمائے جمالیات کے نظریات کی روشنی ہی میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ نظریات یقیناً اہم ہیں، لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے، اب جمالیات کی اصطلاح کا معاملہ دوسری تمام ادبی اور فنی اصطلاحوں سے مختلف ہے، اس اصطلاح نے جہاں فنون لطیفہ کی روح کی گہرائیوں کو سمجھانا شروع کیا ہے وہاں ماضی کے فنون کے جلال و جمال کو دیکھنے، پرکھنے اور ان سے جمالیاتی انبساط پانے کا انداز ہی تبدیل کر دیا ہے۔ جمالیات نے ماضی کے فنون کے نئے جمالیاتی انکشافات کے لئے اکسایا اور بے قرار کیا ہے، اتنی بڑی تبدیلی فنون لطیفہ کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اتنا بڑا انقلاب جو فنون لطیفہ کو دیکھنے کے لئے ایک ہمہ گیر ''وژن'' عطا کر دے، نہیں آیا تھا، اس کے لئے جمالیات کو ایک سائنس یا ایک ایسا علم کہ جس کے حدود مقرر ہوں سمجھنا غلط ہے۔ یہ اصطلاح ایک ایسا نقطہ یا بندو ہے کہ جس میں تمام بنیادی رنگ پوشیدہ ہیں، یہ نقطہ پھیلتا ہے تو ایک ایسا ہمہ گیر دائرہ بن جاتا ہے کہ اس میں حیات و کائنات کے تمام مظاہر سمٹ آتے ہیں اور تمام مظاہر کے رنگ و روپ کو سمیٹ کر سکڑتا ہے تو ایک نقطہ بن جاتا ہے، ایک معنی خیز تہہ دار اصطلاح۔

جمالیات کی اصطلاح نے یہ احساس عطا کیا ہے کہ جمالیات فنون لطیفہ کی روح ہے۔ جمالیاتی فکر و نظر، جمالیاتی نقطہ نگاہ، وجدان و عرفان، جمالیاتی شخصیت و شعور، جمالیاتی موضوع اور طرز ادا کے بغیر کسی فن کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوسکتا، ہر بڑے تخلیقی فن کار کا اپنا ایک جمالیاتی نظام ہوتا ہے جو اپنی جمالیاتی روایات اور اپنے عہد کے جمالیاتی نظام سے گہرا تخلیقی رشتہ رکھتا ہے، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عہد کے جمالیاتی نظام کسی تخلیقی فنکار کا اپنا جمالیاتی نظام قائم ہوتا ہے۔ حسن کا احساس ہی تخلیق کا باعث بنتا ہے اور اس کا بنیادی مقصد جمالیاتی سطحوں پر عرفان عطا کرنا اور مسرت سرمدی سے آشنا کرنا ہے، المیہ یا ٹریجڈی بھی اپنے حسن سے متاثر کرتی ہے، بڑا فنکار اپنی جمالیاتی فکر و نظر اور اپنے ''وژن'' ہی سے ٹریجڈی کو حسن کا جلوہ بنا دیتا ہے۔ ہر اچھی اور بڑی تخلیق جمالیاتی ہوتی ہے۔ معاشرتی، معاشی یا نفسیاتی نہیں ہوتی۔ اگرچہ معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی اقدار و عوامل کے تحرک ہی سے کوئی تجربہ تخیل کا جوہر بنتا ہے۔ جمالیات صرف کروچے، ہیگل، کانٹ، بام گارٹن، لیسنگ، شلر، وائٹ ہیڈ، برک اور ہیوم وغیرہ کے تصورات و خیالات کا نام نہیں اگرچہ یہ اور ایسے جانے کتنے علما نے جمالیات کی گرہیں کھولی ہیں اور بصیرتیں عطا کی ہیں، فنون لطیفہ کی روح تک رسائی ایسے خیالات سے یقیناً مختلف انداز سے ہوتی ہے، لیکن جب فنون لطیفہ کے جوہروں کی پہچان کا معاملہ پیش نظر ہوتا ہے تو قاری یا ناقد کی اپنی جمالیاتی بصیرت ہی فنکاروں کی جمالیات سے تخلیقی رشتہ قائم کرتی ہے اور اسی رشتے سے جمالیاتی انکشافات ہوتے ہیں۔ ❁❁

تصحیح و اعتذار

''زبان وادب'' مئی ۲۰۱۶ء کے شمارے میں ص ۴۷ پر جناب احمد نثار کی نظم کے ساتھ دھنباد کے احمد نثار کا پتہ شائع ہوگیا تھا جب کہ مذکورہ نظم احمد نثار مبئی کی ہے جنہوں نے ابھی تک یاد دہانی کے بعد بھی اپنا پتہ نہیں بھیجا ہے۔ ادارہ اس سہو کے لئے معذرت خواہ ہے۔

PDF Compressor Free Version

فکشن یاترا

شکیل الرحمٰن

احمد ندیم قاسمی کی تخلیق ''بین''

جس طرح سفید کنول پاکیزگی کی ایک خوبصورت علامت ہے، اسی طرح وہ سولہ سترہ سال کی بچی رانو پاکیزگی اور تقدس کی ایک خوبصورت علامت ہے۔ سفید کنول کی مانند، تالاب کی سطح پر اپنے خالص شعور (Pure Consciousness) کے ساتھ، اپنے پاکیزہ شعور کے ساتھ۔

''بین'' صرف اس بچی کی کہانی نہیں ہے، یہ پورے معاشرے کی ایک انتہائی دردناک داستان ہے۔ سفید کنول کے تالاب میں ایک زہریلا ناگ اچانک کنول اور اس کے حسن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ کنول ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور دل لرز اٹھتا ہے، پھر ہم اپنے دل سے ٹپکتے ہوئے لہو کے قطروں کی آواز سنتے ہیں، ٹپ.....ٹپ.....ٹپ.....

''بین'' ایک انتہائی دردناک اور دردانگیز کہانی ہے۔ مجھے معلوم نہیں دنیا کی کسی بھی زبان میں ایسی دردناک اور دردانگیز یا اس سے زیادہ دردناک کہانی لکھی بھی گئی ہے یا نہیں۔ اردو زبان میں تو اب تک لکھی گئی نہیں شاید۔ اگر کوئی کہانی لکھی بھی جائے گی تو اس سے زیادہ دردناک غالباً نہیں ہوگی۔

کہانی کی تکنیک ماں کے کلیجے کے لہو، ماں کے انتہائی گہرے درد و غم اور ماں کی روح کے کرب سے مرتب ہوئی ہے۔ یہ اردو کا ایک انتہائی، غیر معمولی افسانہ نگار اپنا قلم لئے اس بچی کی ماں کے پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ اس کے الفاظ ماں کے کلیجے کے لہو میں ڈوب ڈوب گئے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کے تخلیقی ذہن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

کہانی ''ماں'' کی درد بھری آواز سے شروع ہوتی ہے۔ ''ماں'' کی درد بھری آواز کے ساتھ کہانی ختم ہوتی ہے، یہ ''بین'' ہے۔ ہر جملہ درد و کرب میں ڈوبا ہوا ہے۔ آہنگ میں اتنا پتھوس (Pathos) ہے کہ حساس قاری کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ کہانی کی تکنیک ایسی ہے کہ ہر لمحہ محسوس ہوتا ہے، جیسے سسکیوں کے زیر و بم میں کہانی سنائی جا رہی ہے۔ بچی کا مرثیہ پورے معاشرے اور اس معاشرے کے اخلاقی زوال کا مرثیہ ہے۔ ماں کی آرزوؤں اور تمناؤں کی شکست کا مرثیہ ہے۔ کتنے درد کے ساتھ یہ کہانی لکھی گئی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کہانی پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ فن کار کا تخلیقی کرب یقیناً غیر معمولی نوعیت کا ہوگا۔

کہانی کی ابتدا ماں کی خوبصورت یادوں سے ہوتی ہے۔ یادوں کی بھینی بھینی خوشبو ملنے لگتی ہے:

> ''بس کچھ ایسا ہی موسم تھا میری بچی، جب تم سولہ سترہ سال پہلے میری گود میں آئی تھی، بکائن کے اودے اودے پھول اسی طرح مہک رہے تھے اور پیڑوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک اس طرح بھاگی پھرتی تھیں اور ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ جب تم میری گود میں آئی تھیں تو دیئے کی کالی پیلی روشنی میں اونگھتا ہوا کوٹھا چمکنے سا لگا تھا اور دایہ نے کہا تھا کہ ہائے ری اس چھوکری کے تو انگ انگ میں جگنو ٹکے ہوئے ہیں۔ اس وقت میں نے بھی درد کے خمار میں اپنے جسم کے اس ٹکڑے کو دیکھا تھا اور مجھے تو یاد نہیں، پر دایہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں مسکرا کر تمہارے چہرے کی دمک میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کوئی خط پڑھتا ہے۔''

جب بچی کے باپ نے یہ کہا:

PDF Compressor Free Version

''تو کیا جانے کہ خدا اتنی خوبصورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے..... تو..... اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ میں تمہارے بابا کی آنکھیں ان کی کھوپڑی سے نکال کر باداموں کی طرح توڑ دوں .....وہ تمہاری خوبصورتی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پھر اس نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تم سے ڈرتے ڈرتے گزار دیئے۔ وہ اب بھی ڈرا اور سہا ہوا باہر گلی میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر لوگوں میں گھرا بیٹھا ہے اور آسماں کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کوئی اس کی طرف آرہا ہے..... جب تم پانچ سال کی ہوئیں تو میں نے قرآن شریف پڑھانے کے لئے تمہیں بی بی جی کے پاس بٹھا دیا تب پتہ چلا کہ تمہاری آواز بھی تمہاری طرح خوبصورت ہے.....ایک بار مزار سائیں دولہے شاہ جی کے مجاور سائیں حضرت شاہ ادھر سے گزر رہے تھے اور تمہاری آواز سن کر انہوں نے کہا تھا یہ کون لڑکی ہے جس کی آواز میں ہم فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن رہے ہیں..... خدا اور رسول کے بعد تم سائیں دولہے شاہ جی کا نام جپتی رہتی تھیں اسی لئے تو تمہارا بابا ایک بار تمہیں سائیں دولہے شاہ جی کے مزار پر سلام بھی کرالایا تھا.....سائیں حضرت شاہ کا ایک خادم آیا اور اس نے بتایا کہ کل سے سائیں دولہے شاہ جی کا عرس ہے جو تین دن تک چلے گا اور سائیں حضرت شاہ نے خواب میں سائیں دولہے شاہ جی کو دیکھا ہے اور یہ فرماتے سنا ہے کہ میری چیلی رانو کو بلا کر تین دن تک اس سے میرے مزار پر قرآن شریف کی تلاوت کراؤ ورنہ سب کو بھسم کردوں گا.....تم مزار شریف کی طرف یوں کھنچی چلی گئی تھیں جیسے سائیں دولہے شاہ جی تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لئے جارہے ہوں۔ مزار شریف کو بوسہ دے کر اور اس کے ایک طرف بیٹھ کر تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کردی اور تمہاری آواز کی مٹھاس چکھنے کے لئے عرس پر آنے والے لوگ مزار شریف پر ٹوٹ پڑے تھے..... سائیں دولہے شاہ جی اور سائیں حضرت شاہ اور ان کے گھرانے کی بی بیوں کی امانت میں دے کر ہم دونوں یہ کہہ کر واپس آگئے تھے کہ عرس کے تین دن گزرنے کے بعد اگلے روز ہم اپنی نعمت لینے حاضر ہوجائیں گے۔''

پھر ایک انتہائی الم ناک منظر سامنے آتا ہے:

''اے میری بچی، اے میرے جگر کی ٹکڑی، اے میری صاف ستھری رانو بیٹی! پھر جب تین دنوں کے بعد ہم دونوں سائیں دولہے شاہ جی کے مزار شریف پر گئے تھے تو تم وہیں بیٹھی تھیں جہاں ہم تمہیں بٹھا گئے تھے، مگر کیا یہ تم ہی تھیں؟ تمہاری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں، تمہارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں تھیں، تمہارے بال الجھ رہے تھے، چادر تمہارے سر سے اتر گئی تھی، مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمہیں اپنا سر ڈھانپنے کا خیال نہیں آیا تھا، تمہارا رنگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلا پڑی تھیں مجھ سے دور رہو بابا میرے پاس نہ آنا اماں، میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اس وقت تک رہوں گی جب تک سائیں دولہا شاہ کا مزار شریف نہیں کھلتا اور اس میں سے ان کا دست مبارک نہیں نکلتا، جب تک فیصلہ نہیں ہوتا، میں یہیں رہوں گی جب تک انصاف نہیں ہوگا۔ میں یہیں رہوں گی اور مزار شریف کھلے گا..... پھر تمہیں ایک دم بہت سا رونا آگیا تھا، مگر تم نے اپنے آنسو روک لئے تھے اور تم بھیگی ہوئی آواز میں تلاوت کرنے لگی تھیں۔ آس پاس کھڑے بیسوں لوگ ہمارے ساتھ زار و قطار رونے لگے تھے اور کہنے لگے تھے 'اثر ہوگیا ہے دن رات مزار شریف پر رہنے سے اس پر اثر ہوگیا ہے.....تمہارے بابا نے فریاد کی تھی اثر ہوگیا ہے؟ دن رات قرآن شریف کی تلاوت

PDF Compressor Free Version

کرنے والی لڑکی پر کوئی اثر کیسے ہوسکتا ہے اور اگر تم کہتے ہو کہ اثر ہوگیا ہے تو سائیں حضرت شاہ کہاں ہیں؟ وہ روتا ہوا سائیں شاہ کی طرف چل پڑا تھا اور میں بلکتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے تھی، مگر ہمیں خادموں نے بتایا کہ سائیں جی تو عرس کے فوراً بعد ایک حجرے میں بند ہوکر بیٹھ جاتے ہیں اور کئی دنوں تک وظیفہ فرماتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے، پھر میں نے اندر بی بیوں کے پاس جانا چاہا تھا، مگر بڑے دروازے پر خادماؤں نے بتایا تھا کہ رانو کی حالت سے بی بیاں پہلے ہی بہت پریشان ہیں اور انہیں زیادہ پریشان کرنا گناہ ہے۔"

سائیں جی کو بھی اس بچی کی حالت کا بڑا دکھ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں "لڑکی اچانک جن بھوت کے قبضے میں چلی گئی ہے" سائیں جی کا ملازم یہ خبر دیتے ہوئے کہتا ہے کہ سائیں حضرت شاہ ایک خاص وظیفہ فرمارہے ہیں کہ جن اترے۔ والدین واپس چلے جائیں ان کی امانت چند دنوں میں انہیں واپس مل جائے گی، بچی پر دیوانگی سی طاری ہوجاتی ہے، نئے کپڑوں کے جوڑے کو درگاہ شریف کے لنگر کی دیگ کے نیچے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیتی ہے، مزار شریف کے سرہانے جھک کر کوئی دراڑ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تلخ سچائی کی پرچھائیں اس طرح ابھرتی ہے:

"جب ہم ٹوٹے پھوٹے واپس آرہے تھے تو بی بیوں کی ایک بوڑھی خادمہ نے مجھے ایک طرف لے جاکر بتایا تھا کہ عرس کے تیسرے دن سائیں حضرت شاہ مزار کی طرف آئے تھے تو تمہاری بدنصیب بیٹی نے مزار شریف پر سے گول گول لہریئے پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لئے تھے اور چیخ چیخ کر کہا تھا کہ سائیں! مزار شریف سے دست مبارک تو جب نکلے گا۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں دولہے شاہ جی کے دیئے ہوئے ان پتھروں سے تمہارا ناس کردوں گی۔"

"اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے۔"

اس ایک جملے سے رانو کے دل خراش تجربے کا المیہ ذہن پر فوراً نقش ہوجاتا ہے۔ رانو کا انتقال ہوجاتا ہے۔

"پھر ہم تمہیں یہاں گھر میں اٹھالائے اور جب ابھی ابھی صبح سویرے سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم سائیں جی کی طرف سے تمہارے لئے کفن لایا تو تم پر سے اترا ہوا جن جیسے تمہارے بابا پر آگیا، اسی نے کفن ہاتھ میں لیا اور اسے اس چولہے میں جھونک دیا جس پر تمہیں غسل دینے کے لئے پانی گرم کیا جارہا تھا۔"

اس "بین" کا اختتامی لمس کلیجے کو جیسے نوچ لیتا ہے اور ہم احمد ندیم قاسمی کی ارفع ترین فن کاری کو حیرت سے تکنے لگتے ہیں:

"اب میرے جگر کی ٹکڑی، میری نیک اور پاک، میری صاف اور ستھری رانو بیٹی، آؤ میں تمہارے ماتھے کے بجھے ہوئے چاند کو چوم لوں۔ دیکھو کہ بکائن کے اودے اودے پھول مہک رہے ہیں اور پیڑوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک بھاگی پھر رہی ہیں اور ایسی ہوا چل رہی ہے، جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی اور چاروں طرف تمہاری تلاوت کی گونج اور سائیں حضرت کے بھیجے ہوئے کفن کے جلنے کی بو اب تک سارے میں پھیل رہی ہے اور میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہوگیا ہے، جب تمہیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا۔"

"میرے اندر
اتنا بہت سا درد جمع ہوگیا ہے
جب تمہیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا!"

دل لرز اٹھتا ہے پھر ہم اپنے دل سے ٹپکتے ہوئے لہو کے قطروں کی آواز سننے لگتے ہیں۔ ٹپ.....ٹپ.....ٹپ

"فنتاسی تخلیقی فکر و نظر کی ایک صورت ہے اور اس کا رشتہ نفسیات سے گہرا ہے۔ انسان کے ہیجانات (impulses) اس کی تخلیق میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔"

(پروفیسر شکیل الرحمٰن)

PDF Compressor Free Version

فکشن یاترا

شکیل الرحمٰن

لمبے قد کا بونا: تجزیاتی مطالعہ

فکشن یاترا میں مجھے ''لمبے قد کا بونا'' بھی ملا جو نئے افسانے میں اپنے لمبے قد کو اس طرح ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اسے سر اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں حالانکہ وہ کسی ہوا باز کی طرح ہوا میں تیرتا باہر زمین پر سر کے بل گرتا ہے۔ چشم زدن میں سر، گردن، شانہ سب ایک ہو جاتے ہیں، اس کا قد تین کے بجائے دو فٹ ہو جاتا ہے۔

یہ مشتاق احمد نوری کا متحرک کردار ہے جو اردو فکشن میں زندہ رہے گا۔ مشتاق احمد نوری کئی بہت اچھے افسانوں کے خالق ہیں، یہ افسانے اردو فکشن میں اضافہ ہیں مثلاً ''جن کی سواری''، ''وردان''، ''لمبی ریس کا گھوڑا''، ''خودکشی''، ''بند آنکھوں کا سفر''، ''سچ''، ''ایک مٹھی تم''، ''کیل اندر اندر''، ''گلاب بابو''، ''حرف آخر''، ''کائیں کائیں''، ''پتھر کی لکیر'' وغیرہ۔ ان کے فن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ افسانہ نگار معمولی واقعات و کردار کے اندر غیر معمولی سچائیوں کو پانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں اسے کامیابی ہوتی ہے۔ ''لمبے قد کا بونا'' اس بات کی عمدہ مثال ہے، معمولی واقعات اور معمولی عام جانے پہچانے کردار کے اندر افسانہ نگار نے غیر معمولی سچائی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو افسانے میں ایک بونے کی سائیکی (Psyche) میں جھانکنے کی یہ غالباً پہلی کوشش ہے۔ فکشن کا اچھا فنکار زندگی اور اس کے مسائل کے تجربے حاصل تو کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی کسی نہ کسی معجزے کی تلاش میں بھی رہتا ہے ''معجزہ'' ہو جاتا ہے تو وہ خود حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اپنے کردار کے باطن کا عطا کیا ہوا ''تحیر'' قاری کے حوالے اس طرح کر دیتا ہے کہ وہ ''معجزہ'' اور فنکار کا ''تحیر'' قاری کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔

کہانی کا مرکزی کردار راجن ہے جو بونا ہے۔ اسی کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ اس کا تعلق پورنیہ شہر کے ایک دولت مند تاجر گھرانے سے ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ پورنیہ کالج سے انگریزی ادب میں آنرز ہے۔ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے، اسے والدین کا پیار بھی نصیب ہے، لیکن وہ ہر وقت یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ والدین پیار سے زیادہ اس پر رحم کھا رہے ہیں۔ ان کے پیار کے اندر ترحم کا جذبہ ہے۔ یہ احساس اسے کاٹے کھائے جا رہا ہے۔ والدین کے پیار کو تضحیک سمجھتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایسی چمک ہے جو دوسروں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اچھے لباس کا شوقین ہے۔ کمر سے اوپر عام آدمیوں جیسا ہے صرف اس کے ہاتھ پاؤں چھوٹے ہیں، تین فٹ کا قد ہے اور اپنے قد کی وجہ سے مار کھا جاتا ہے۔ کالج میں مذاق کا نشانہ بنتا ہے، لیکن جلد ہی اپنی صلاحیتوں سے ساتھیوں کو مرعوب کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود اسے محسوس ہوتا کہ کالج اور کالج کے باہر ہر شخص اس پر رحم ہی کھاتا رہتا ہے۔ کوئی اسے مکمل آدمی نہیں سمجھتا۔ اسی احساس کی شدت اس کی سائیکی کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے۔ اپنی بھاری آواز سے بھی مکمل آدمی ہونے کا ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ انگریزی ادب میں آنرز، لیکن تین فٹ کا بونا، جو بھی اسے دیکھتا ہے اس کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ اس سے ہمدردی کرنے والے یا اس پر رحم کھانے والے بھی اسے پسند نہیں ہیں۔ وہ اندر ایک مکمل آدمی ہے، لیکن اسے کوئی مکمل آدمی نہیں سمجھتا۔ راجن کے اندر، اس کی سائیکی کی گہرائیوں میں جو کشمکش اور تصادم ہے اس سے ٹریجڈی کی پوشیدہ گہرائی بڑی شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ چھپی ہوئی پوشیدہ ٹریجڈی کی گہرائیوں (Hidden depth of tragdey) میں ایک بے چین مضطرب روح ملتی ہے جو سرکس میں شامل ہونے کے بعد شالو سے اپنی محبت کو سب سے بڑا سہارا بنا لیتی ہے۔ بظاہر جیسا بھی ہو، جنسی طور پر بیدار ہے۔ شالو مرکز نگاہ بنتی ہے۔ شالو بھی راجن کی طرح سرکس میں

PDF Compressor Free Version

کام کرتی ہے۔ تین فٹ کا بونا اپنے ہر کھیل میں اپنی شخصیت کا سکہ جما دیتا ہے اور شالو کبھی ٹیبل پر رکھی سائیکل چلاتی ہے، کبھی راجن کی اچھالی ہوئی طشتریوں، قلفیوں کو سنبھالتی رہتی ہے اور ہر شو میں نیم برہنہ جھولے پر جھولتی رہتی ہے۔ جھولے پر کرتب دکھاتے ہوئے کبھی راجن کا ہاتھ تھامتی ہے اور کبھی شیرا کا۔ شیرا سرکس میں جھولے کا سب سے ماہر کھلاڑی ہے۔ خاندانی کرتب باز، لمبا، گورا چٹا، کئی پشتوں سے سرکس کا آدمی ہے۔ وہ بھی شالو پر عاشق ہے۔ شالو بھی اسے پسند کرتی ہے۔ افسانہ نگار نے سرکس میں جھولے کی ایک پرکشش تصویر اس طرح پیش کی ہے:

''راجن نے شیرا کی ناک نہ کٹنے دی بلکہ اس کی شہرت اور وقار میں اضافہ ہی کیا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پیر جھولے میں پھنسا کر اپنا بدن نیچے لٹکا دیتا ہے، پھر اچانک ہوا میں پلٹے کھاتا، دوسری جانب سے لڑکیاں جھولتی ہوئی آتیں اور راجن انہیں ہوا میں ہی سنبھال لیتا، پھر وہ ان کے پاؤں میں پاؤں پھنسا کر ایسی قلابازیاں کھلاتا کہ لوگوں کی چیخ نکل جاتی، سب سے اچھا شو وہ تب دکھاتا جب شالو کا ایک ہاتھ اس کے پاؤں میں پھنسا ہوتا، وہ شالو کو ہوا میں لہراتا، پھر اپنے پاؤں سے یوں پھرکی گھماتا کہ پنڈال تالیوں سے گونج جاتا۔ آخر میں وہ شیرا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر جھولتا، شیرا اسے ہوا میں پھرکی گھماتا، پھر وہ اوپر کی پٹڑی پر چلا جاتا اور جب دوسری بار شیرا جھولتے ہوئے ادھر آتا تو وہ اسے اپنے ہاتھ کی بجائے اپنا پاؤں تھما دیتا، شیرا کے ہاتھ میں راجن کے پاؤں کی بجائے صرف راجن کا پاجامہ آتا، راجن دھڑام سے نیچے رسیوں کی جالی پر گرتا اور لوگ قہقہوں سے اس کا استقبال کرے۔''

سرکس کے ایسے ہی ہنگامہ خیز ماحول میں ایک جانب جیسے وقت اچانک رک سا جاتا ہے:

''اسے کیا پتہ تھا کہ ایک دن راجن جیسا بونا اچانک سامنے آ کر اس کا راستہ روک لے گا اور کہے گا شالو تم یہ باور کیوں نہیں کر لیتیں کہ میں محض ایک بونا نہیں ہوں۔''

معمولی واقعات کے اندر سے ایک غیر معمولی واقعہ اچانک پھوٹ پڑتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے، فنکار اس تحیر کو قاری کے حوالے کر دیتا ہے، کچھ اس طرح کہ یہ غیر معمولی واقعہ اور فنکار کا تحیر قاری کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ راجن کی محبت کے روحانی سفر میں یہ منظر بھی کہانی میں گہرائی پیدا کرتا ہے:

''اور اس رات شالو نے راجن کے خیمے میں آ کر اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا تھا 'راجن ..... آج تم نے سب کو یہ باور کرا دیا کہ تم صرف بونے نہیں ہو..... اور تم ..... وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا 'شالو..... تم بھی یہ کیوں نہیں مان لیتی کہ میں صرف بونا نہیں ہوں..... شالو کچھ بھی بول نہ پائی، بس اس کی جانب چپ چاپ دیکھتی رہ گئی تھی۔''

طبقاتی زندگی میں جو اتھل پتھل ہے اور اقدار زندگی کی شکست و ریخت کی جو کیفیت ہے ان میں استحصال کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ کمزور طبقوں کا استحصال اس بڑی سوسائٹی پر انتہائی بدنما داغ ہے۔ راجن ایک پڑھا لکھا سمجھدار بونا ہے جو اپنے ہر خاص شو کو مختصر ڈراما بنا دیتا ہے اور سماج میں استحصال کی صورت کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہنستے ہوئے، قہقہے لگاتے لوگ کچھ دیر بعد ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اس بونے نے دکھتی رگوں پر انگلی دھر دی ہے:

''ایک طرف تو لوگ ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ لیتے اور دوسری طرف انہیں احساس ہوتا کہ اس بونے نے ایک ایسی پھانس ان کے دلوں میں چبھو دی ہے جس کو آسانی سے نکالا نہیں جا سکتا۔ اپنے شو کی کامیابی کے نشے میں کبھی کبھی راجن کو سب بونے نظر آتے اور خود اپنا قد اسے سب سے اونچا نظر آتا۔''

سرکس بھی اسی سماج کا ایک ادارہ ہے۔ یہاں بونوں کو انسان تسلیم نہیں کیا جاتا۔ وہ بچوں کی فہرست میں بھی مشکل ہی سے شمار ہوتے ہیں۔ بچوں کی طرح ہی ان سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔ بے چارے بونے اُف نہ

PDF Compressor Free Version

کرتے، سماج کے ٹھکرائے یہ بونے سرکس کو اپنی پناہ گاہ تصور کرتے ہیں۔اس ادارے میں بونوں کا ہمیشہ ہی استحصال ہوتا رہا ہے، اسی طرح سرکس میں کام کرنے والی لڑکیوں کا جنسی استحصال ہوتا رہا ہے۔دونوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔سرکس کے مالک، منیجر، پہلوان اور دیگر طاقتور کام کرنے والی لڑکیوں پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ راجن ان حالات سے واقف ہے،اس پڑھے لکھے بونے کو یہ دونوں باتیں بری لگتی ہیں،لہٰذا وہ انہیں ان کا حق دلانے کے لئے جدوجہد کرتا ہے، خفیہ طور پر اپنی مہم جاری رکھتا ہے۔ شالو اس کی ترجمان بن جاتی ہے اور سرکس میں کام کرنے والی لڑکیوں کو متحد کرنا شروع کر دیتی ہے۔تمام بونے اور تمام لڑکیاں اب راجن کا احترام کرنے لگتی ہیں، اس لئے کہ وہ ان کے کاز کے لئے جدوجہد کرنے والا ہے۔ اب یہ بونا شیرا کی آنکھوں میں کھٹکنے لگتا ہے، وہ شالو کو راجن کے پاس دیکھنا نہیں چاہتا اور ایسا ہوتا ہے کہ سرکس کے الوداعی شو میں ایک حادثہ ہو جاتا ہے۔ حادثہ بڑا ہے یا چھوٹا معلوم نہیں۔ یہ ضرور معلوم ہے کہ جھولے سے گرنے کے بعد راجن بونے کا قد تین کی بجائے دو فٹ رہ گیا ہے۔اس کا ذمہ دار شیرا ہے۔ اسی نے جان بوجھ کر راجن کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہا ہے۔ سارا پنڈال تالیوں کے شور سے گونج رہا ہے اور راجن کا سر، گردن، شانہ سب ایک ہو گئے ہیں۔اس کا قد تین کی بجائے دو فٹ ہو گیا ہے۔اختتام تک پہنچتے پہنچتے قاری کو ہر شخص بونا نظر آنے لگتا ہے اور راجن بونے کا قد سب سے اونچا بہت اونچا۔

اس کہانی میں شعور اور تحت الشعور کی کشمکش اور تصادم نے ''سائیکی'' کے ہیجان کو قاری کے ذہن و شعور سے بہت قریب کر دیا ہے۔اس المیہ ڈرامے میں خواب اور فنتاسی نہیں ہے۔ایک زندہ نفسی حقیقت ہے جو المیہ کردار کے زوال (Fall) سے قاری کو نفسیاتی سطح پر آسودگی بخشتی ہے، قاری المیہ کے جمال سے متاثر ہوتا ہے۔ صلیب پر چڑھانے کے بعد لہولہان حضرت عیسیٰ کا حسن کتنے لوگوں نے دیکھا ہوگا ہمیں معلوم نہیں، البتہ ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ایسے ہی جمال سے دنیا نکھر گئی ہوگی، دنیا میں حسن بکھرا ہوگا، ان کے لہو سے زندگی کا چہرہ دھلا ہوگا اور دنیا کو اپنے سچے حسن کو پہچاننے میں مدد ملی ہوگی۔

''پتھوس'' (Pathos) کو ''سبلائم'' (Sublim) میں تبدیل کر دینا بڑا کام ہے۔ اس بڑے کام کے لئے مشتاق احمد نوری میں یقیناً بڑی صلاحیت موجود ہے۔نوری کے پاس فکشن میں نئی دنیاؤں کو خلق کرنے کا ایک بیدار ذہن ہے جس سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

ملیالم کے معروف فکشن نگار او۔وی۔ویان (O.V.Viyan) نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا "All True Arts Are Sufferings" اچھا فکشن نگار زندگی کی سچائیوں پر نظر جمائے داخلی دنیا میں اتر جاتا ہے جو تجربوں کا بہت بڑا گہوارہ ہے۔ تلاش کرتے ہوئے باطن میں اسے بہت کچھ مل جاتا ہے۔اپنی حسیات کے ذریعہ پراسرار اور حیرت انگیز تجربے حاصل کرتا ہے۔ صرف دانشورانہ سطح کی توانائی یا انرجی سے افسانہ لکھا نہیں جا سکتا، اندر گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔ فکشن نگار کو اس سچائی کا عرفان حاصل ہو جائے کہ ہر کردار الوہی خصوصیت رکھتا ہے تو فکشن کا معیار بہت بلند ہو سکتا ہے۔ فکشن یاترا کرتے ہوئے اب تک مجھے جو اچھی کہانیاں ملی ہیں ان میں ایک یہ کہانی بھی ہے:

''لمبے قد کا بونا'' ❁❁

اختر الایمان: شکیل الرحمٰن کے آئینے میں (ص ۴۵ سے آگے)

چاہئے، ماضی ایک خواب آلود کیفیت لئے ابھرتا ہے
اور کچھ سچائیاں ان میں جگنو کی مانند چمکنے لگتی ہیں۔
یادوں نے ایک خوبصورت سی تمثیل پیش کر دی ہے۔
اختر الایمان کے فطری مکالموں اور سوچ اور یادوں نے
لمحوں سے ایک رومانی فضا خلق کر دی ہے۔''

اس کتاب کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک اچھی تخلیق کی پرکھ اچھا پارکھ ہی کر سکتا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے بڑی ذہانت اور ذوق لطیف کے ساتھ نہایت دیانتداری سے اختر الایمان کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا یہ کارنامہ ادب کے طالب علموں کے لئے ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگا، ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے گا اور اردو ادب میں ایک یادگار کی حیثیت حاصل کرے گا۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

ہماری سرگرمیاں

بیگوسرائے میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا شاندار انعقاد

پٹنہ: گزشتہ دنوں ۱۰ مئی کو بیگوسرائے میں بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا شاندار انعقاد ہوا۔ اس موقع پر وزیر اقلیتی فلاح و کارگزار صدر اکادمی ڈاکٹر عبدالغفور نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ اردو ہماری تہذیب ہے، ہماری پہچان ہے، مگر ہم اردو والے ہی اپنی ناعاقبت اندیشی سے، اسے ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اردو کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت پابند عہد ہے۔ ریاست کے مختلف اضلاع میں اردو مترجم بھی ہیں، ٹائپسٹ بھی اور اردو اسکول بھی، مگر افسوس یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے ہیں اور نہ ہی اردو میں درخواستیں موصول ہوتی ہیں۔ ہمارے مدارس میں تعلیم کا نظام اچھا ہے، مگر امتحانات کا ماحول اطمینان بخش نہیں ہے۔ اگر ہم اردو والے اپنی ذمہ داریاں بھولتے رہیں اور امتحانات میں پیروی ہوتی رہے تو ایسے حالات میں ہم اپنی تعلیم گاہوں کو باصلاحیت اساتذہ مہیا نہیں کر سکتے۔ حکومت نے اقلیتوں کو مختلف قسم کے قرض دینے کی اسکیم چلا رکھی ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے لئے صحیح لوگوں کی درخواستیں آئیں تاکہ صحیح حقداروں تک ان اسکیموں کے فائدے پہونچ سکیں۔ وزیر موصوف نے مزید کہا کہ ہمیں ہر حال میں محنت اور ایمانداری سے کام کرنے اور اردو سے ہمہ جہت ہمدردی بڑھانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ''اکادمی آپ تک'' کو ایک اچھا اور موثر پروگرام بتاتے ہوئے یقین دلایا کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اکادمی سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری کی ہمہ جہت کاوشوں کو ستائشی کلمات سے نوازتے ہوئے وزیر محترم نے کہا کہ دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ لائبریروں کا اکادمی سے الحاق ہو رہا ہے اور یہ بھی ایک بڑی ضرورت ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر تنویر حسن سابق ایم ایل سی نے اپنے صدارتی خطاب میں اکادمی کی حالیہ ترقیات پر اطمینان ظاہر کیا اور اس پروگرام کی پزیرائی کی۔ اس موقع پر سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری نے اپنے مختصر خطبہ استقبالیہ میں وزیر گرامی، مہمان خصوصی اور تمام شرکائے محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی، انہوں نے کہا کہ اس سے قبل دربھنگہ، بتیا اور گیا میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام منعقد ہو چکا ہے جس کا مقصد ان شعراو ادبا اور صحافیوں کی قدر افزائی ہے جنہوں نے پوری زندگی اردو کی خدمت میں لگادی، مگر آج انہیں تقریباً بھلایا جا چکا ہے۔ اس طرح ہم دور دراز علاقوں میں اردو تہذیب و تقریب کا ماحول بھی تازہ رکھنا چاہتے ہیں۔ جناب نوری نے بتایا کہ یہ پروگرام آئندہ بھی جاری رہے گا اور مظفر پور، سمستی پور وغیرہ اضلاع میں جلد ہی اس کا انعقاد ہوگا۔

اس موقع پر حسب پروگرام جناب عبدالصمد تپش، پروفیسر ظفر حبیب اور جناب شاہ غلام سلطانی احقر کی شال، مومنٹو اور اسناد پیش کر کے قدر افزائی کی گئی اور ان حضرات کو اکیس اکیس ہزار نقد رقم بھی دی گئی۔ جناب تپش پر محترم راشد طراز نے اپنا مقالہ پڑھا جب کہ ڈاکٹر محمد شرف الدین نے اپنے خطاب میں جناب تپش کی خدمات کا تذکرہ کیا۔ پروفیسر ظفر حبیب پر ڈاکٹر شبیر حسن نے مقالہ پیش کیا اور پروفیسر انیس صدری نے اپنی تقریر میں جناب ظفر کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر خالد محمود نے جناب شاہ غلام سلطانی احقر کی خدمات پر مقالہ پڑھا اور جناب اشعر حمیدی نے اپنے خطاب میں ان کے کارناموں کا تجزیہ کیا۔

واضح رہے کہ بیگوسرائے کی دھرتی پر منعقد ہونے والے اس پروگرام کو زبردست عوامی پزیرائی ملی۔ یہ پروگرام عابد حسین میموریل اسکول، بلیا (وائیکا کیمپس) این ایچ ۳۱ میں منعقد ہوا تھا۔ مذکورہ ہال کے مالک جناب جاوید اختر کی طرف سے وزیر محترم ڈاکٹر عبدالغفور، سابق ایم ایل سی ڈاکٹر تنویر حسن اور سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری کو شال اور بکے پیش کیا گیا اور تینوں اعزاز یافتگان کے ساتھ، وزیر محترم اور سکریٹری موصوف کو

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر تنویر حسن نے بھی اپنی رہائش گاہ پر شال اور بکے نذر کیا۔ جناب تنویر حسن کا اس تقریب کی کامیابی میں نمایاں حصہ رہا۔ انہوں نے تمام مہمانوں اور دیگر صدہا حضرات کے لئے پرتکلف ظہرانے کا اہتمام کیا اور شروع سے آخر تک پوری دلچسپی لیتے رہے۔ ان کے ساتھ جناب طارق متین اور عابد حسین اسکول کے مالک جاوید اختر کا بھی زبردست تعاون حاصل رہا۔ اس موقع پر وزیر محترم نے لکھمنیا کی قدیم اسٹوڈنس اردو لائبریری کا بھی معائنہ فرمایا جس کی جدید عمارت حالیہ دنوں میں ایم ایل اے فنڈ سے بنی ہے۔ اکادمی سکریٹری نے لائبریری کے الحاق کا اعلان کرتے ہوئے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

اکادمی اشتراک سے المنصور ٹرسٹ کے زیر اهتمام سمینار

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ کے زیر اہتمام ملت کالج دربھنگہ میں بہار اردو اکادمی کے اشتراک سے گزشتہ دنوں قومی سمینار بعنوان ''بہار میں اردو صحافت: سمت و رفتار'' کا انعقاد ہوا، جس کا افتتاح سابق وزیر محمد علی اشرف فاطمی، بہار اردو اکامی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری، پرو وائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین اور پرنسپل ڈاکٹر محمد رحمت اللہ کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض عبدالمتین قاسمی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے استقبالیہ نظم پیش کرتے ہوئے تشریف آوری کے لئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ٹرسٹ کے سکریٹری منصور خوشتر نے ٹرسٹ کی کارکردگی بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایم ایس اشرف فرید (چیف ایڈیٹر قومی تنظیم پٹنہ) کی قیادت اور سرپرستی میں ایک سو پچیس سے زائد ادبی و شعری نشست، چھ کل ہند و ریاستی سمینار کا انعقاد اور ''دربھنگہ ٹائمز'' کی اشاعت وغیرہ ٹرسٹ کا اہم کارنامہ ہے۔

اس موقع پر مہمان خصوصی سابق وزیر محمد علی اشرف فاطمی نے ریاست میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ کوئی زبان کسی ایک مذہب کی نہیں ہوتی ہے۔ یہ افسوسناک معاملہ ہے کہ اس ملک میں ایک سازش کے تحت اردو زبان کو ایک مذہب سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے جس پر ہم بھی بہت خوش ہیں جب کہ سچائی یہ ہے کہ اردو زبان یہیں پیدا ہوئی۔ اس سے خوبصورت زبان ہندوستان میں نہیں ہے۔ اردو ملک کو جوڑنے والی زبان ہے۔ اردو کو پورے ملک میں مرکزیت حاصل ہے۔ زبانیں وہی زندہ رہتی ہے جس کو روزگار سے جوڑا جائے اور اس لیے میں نے اپنی وزارت میں اس کی پہل بھی کی تھی۔

بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق نوری نے کہا کہ اس وقت پورے بہار میں صحافت پر سیمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔ یہ نیک فال ہے۔ اردو صحافت کے دو سو سال پورے ہو گئے ہیں جو اس کی زندگی و تابندگی کا ثبوت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ صحافت صرف قلم کو کاغذ پر گھسیٹنے کا نام نہیں بلکہ ایک عبادت ہے۔ انہوں نے کہا کہ صحافت نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور آزادی کی جنگ لڑی جو ایک روشن تاریخ ہے۔ آج کے صحافی اپنی اہمیت اور قوت کا اندازہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ اب صحافت مجبوری کا ایک نام ہو گیا ہے۔ صحافت میں استحصال کا دور ہے۔ اردو ہمارا تشخص ہے اور اگر ہم اردو سے محروم ہو گئے

PDF Compressor Free Version

تو ہم اپنے تشخص سے محروم ہو جائیں گے، اس لیے ہمیں اردو اخبار ضرور پڑھنا چاہیے۔

اپنے خطاب میں پروفیسر سید ممتاز الدین نے کہا کہ بہار میں اردو صحافت کا سنہرا ماضی رہا ہے اور حال بھی روشن ہے، لیکن اس کے باوجود تسلیم کرنا چاہیے کہ یہاں معیار میں کمی آئی ہے اور جس طرح سے ہر میدان کے پروگرام اور بطور خاص علمی و سائنسی پروگراموں کا کوریج ہونا چاہیے وہ اردو صحافت میں نہیں ہو پاتا ہے بلکہ ہر میدان کی رپورٹنگ کے لیے اردو صحافی بھی موجود نہیں ہیں اس صورت حال پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دربھنگہ میں اردو صحافی جس طرح سے محنت کرتے نظر آتے ہیں دوسرے اضلاع میں یہ جذبہ نہیں دیکھا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ضلع میں اسی طرح کے محنت کش صحافی سامنے آئیں۔ ہم دیکھ رہے ہے کہ دربھنگہ میں سمینار ہوتے رہتے ہیں جس سے یہاں کی علمی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ بہار میں اردو صحافت کی روایت کوئی نئی نہیں ہے۔ ۱۸۵۳ء میں بہار سے اردو صحافت کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں سے ہزاروں رسالے نکلے اور بند بھی ہوئے۔ اردو صحافت اگر چہ جنگ آزادی اور تقسیم کے اثرات سے متاثر ہوئی مگر اس کے باوجود اردو صحافت نے ہمیشہ حق کی علم برداری کی۔ ہم لوگوں وسائل کی کمی کا رونا روتے ہیں، لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اردو اخبارات کا معیار گھٹا ہے۔ یہی وجہ ہے لوگ دیگر زبانوں کے اخبارات پڑھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پروگرام کے منتظمین بطور خاص ڈاکٹر منصور خوشتر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ نوجوانوں میں اسی طرح کی لگن اور دلچسپی کی ضرورت ہے جو اردو صحافت کو قرار واقعی بلندی سے آشنا کرتی رہے۔

ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے کالج میں سیمینار کے انعقاد پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ صحافت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے غیر جانب دار ہونا چاہیے، یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ پروگرام کے درمیان بہار اردو اکاڈمی پٹنہ کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کے ہاتھوں ۲۰۱۴ میں کتابوں پر انعام پانے والے دربھنگہ کے ڈاکٹر منصور خوشتر اور ڈاکٹر قیام نیئر کو سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ اس موقع پر شرکا میں، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر شمیم احمد باروی، ڈاکٹر شوکت انصاری، پروفیسر ایس ایم جاوید اقبال، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر حسن اشرف، ریاض الدین جاوید، ڈاکٹر علاء الدین حیدر وانی، محمد صفی الرحمٰن، ڈاکٹر راحت علی، ڈاکٹر عقیل صدیقی، نثار احمد، ڈاکٹر ایوب راعین، پروفیسر شہناز بیگم، شمشاد احمد، منظر صدیقی، انور آفاقی، اظہر نیئر برہولیاوی، محمود بھارتی، پروفیسر ظفر حبیب، پروفیسر شاکر خلیق، سید شہباز عالم، انوار الحسن وسطوی، ریاض دانش، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر ریحان غنی، جاوید رحمانی، ڈاکٹر سید ظفر آفتاب حسین، ایس ایم رضوان اللہ، نظر عالم (قومی صدر آل انڈیا مسلم بیداری کارواں)، محمد مجتبیٰ، محمد شمشاد، محمد حامد انصاری، مولانا اعجاز احمد (سابق چیئرمین مدرسہ بورڈ)، حافظ ابو شحمہ، اعظم حسین، عون احمد، محمد ساجد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کا اختتام المصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر کے اظہار تشکر پر ہوا۔

اکادمی اشتراک سے دربھنگہ میں شاندار قومی سمینار کا انعقاد

پٹنہ: گزشتہ دنوں ۲۷ اپریل کو، بہار اردو اکادمی کے اشتراک سے ''ادبی مرکز'' شیر محمد بھیگو، دربھنگہ میں، سوشل سروسز ٹرسٹ کے زیر اہتمام ''بہار میں اردو کا فروغ لحہ فکر و عمل و وسائل و امکان'' کے عنوان سے ایک شاندار قومی سمینار کا انعقاد ہوا، جس کا افتتاح وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور نے فرمایا۔ اس پروگرام میں وزیر موصوف کے علاوہ سابق وزیر جناب نوشاد عالم، پرووی سی متھلا یونیورسٹی پروفیسر سید ممتاز الدین، پروفیسر طیب صدیقی اور عقیل صدیقی کے ہاتھوں شمع افروزی کی رسم انجام پائی۔ اس موقع پر وزیر محترم ڈاکٹر عبدالغفور نے اپنے افتتاحی خطاب میں فرمایا کہ اردو کے فروغ

PDF Compressor Free Version

کے لئے حکومت کو جو کام کرنا چاہئے حکومت اس سے زیادہ کر چکی ہے۔ کسی بھی سماج کی زبان اور اس کی تہذیب اس سماج کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ جب اچھائی سے منھ موڑ لیا جاتا ہے تو اس قوم کی تنزلی شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ اردو کے مسائل پر گفتگو تو کرتے ہیں، لیکن عمل نہیں ہو پاتا ہے۔ حکومت اردو کے فروغ کے لئے تمام تر کوششیں کر رہی ہے۔ ہم تمام لوگوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں ایک اردو اخبار ضرور خریدیں، کیوں کہ اردو کے اخبار سے گھر کے بچوں کو اردو پڑھنے کا موقع ملے گا اور اردو کو بھی فروغ ملے گا، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہ کہ جس اسکول میں اردو کے ٹیچر نہیں ہیں، وہاں گارجین حضرات اسکول کے ذمہ داران سے مل کر اردو کے اساتذہ کی بحالی کو یقینی بنائیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ دربھنگہ کی ایک تاریخ رہی ہے یہاں کے پرانے لوگ اردو کے بارے میں گہری اور اچھی سوچ رکھتے ہیں، اس لئے میں دربھنگہ کے نوجوانوں سے خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے آبا و اجداد کے ذریعے اردو کے فروغ کے لئے کئے کاموں کو آگے بڑھائیں اور دربھنگہ سے اردو میں نئی روح پھونکنے کا آغاز کریں۔

پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے اقلیتی فلاح کے سابق وزیر نوشاد عالم نے کہا کہ اس حکومت میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اردو میں کچھ بہتر سے بہتر کیا جائے۔ سرکاری کوشش سے صرف اردو کی ترقی نہیں ہو سکتی ہے جب تک ہم اپنے گھروں میں اردو کا استعمال نہیں کریں گے اردو کا فروغ نہیں ہوگا۔ اردو ایک طاقت ور زبان ہے اور اس کے ذریعہ دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر سید ممتاز الدین نے کہا کہ اردو زبان کا تعلق ہماری تہذیب اور تمدن سے ہے، اس لئے ہمیں اپنی زبان کے تحفظ کے لئے خود ہی کوشش کرنی ہوگی۔ اس وقت سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلانے کے لئے حتی الامکان کوشش کریں۔ انہوں نے اردو کے ختم ہوتے رجحان پر روشنی ڈالتے، ہوئے اس کے خاتمہ کی کئی تدابیر کی طرف اشارہ کیا اور بچوں کے رسالوں کو بھی فروغ دینے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس وقت جو کتابیں آ رہی ہیں اس کی زبان بڑی مشکل ہوتی ہے، اس کو آسان بنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اردو اساتذہ کے لئے ریفریشر کورس کا اہتمام بھی کئے جانے کا مشورہ وزیر اقلیتی فلاح کو دیا۔

پروگرام کی نظامت کے فرائض عبدالمتین قاسمی نے انجام دئے۔ افتتاح سے قبل ڈاکٹر عقیل صدیقی اور ڈاکٹر منصور خوشتر دیگر منتظمین نے گلدستہ اور چادر دے کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ منتظمین کی جانب سے ''آل انڈیا مسلم بیداری کارواں'' کے صدر نظر عالم اور ''یورو اسٹون اسپتال'' کے ڈائرکٹر

ڈاکٹر منوج کمار کو بھی اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر احسان عالم، اعظم حسین، عون احمد، سیف الاسلام، فردوس علی، محمد اشرف حسین، سالم علی، محمد فیروز، ڈاکٹر منصوخوشتر، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، ڈاکٹر ایوب راعین، ہارون رشید راعین، بابر علی، ڈاکٹر راحت علی، شکیل احمد صدیقی، نیاز احمد، خلیل احمد صدیقی، دیدار حسین چاند، اشرف حسین ولارے، حبیب اصغر، نورالدین زنگی، نظر عالم، بپو خان، راشد جمال، محمد رضی، عرفان احمد پیدل، ناصر، مطلوب زائر، مہدی رضا، روشن القادری، منور عالم راہی اور عالمگیر شبنم وغیرہ نے اپنے مقالات پیش کئے۔ پروگرام کا اختتام ٹرسٹ کے سکریٹری نثار احمد کے اظہار تشکر پر ہوا۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ اپریل کا ''زبان وادب'' ملا، شکریہ! آپ کے اداریے کا پہلا جملہ برحق ہے کہ ہر کوئی اس بات کا تمنائی ہے کہ وہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھو لے اور ہر طرف اس کی واہ واہ ہونے لگے اور یہ بھی آپ نے صحیح جائزہ لیا ہے کہ میرؔ و غالبؔ سے لے کر فراقؔ اور مجروحؔ تک اور پریم چند، کرشن چندر سے لے کر منٹو اور بیدی تک سبھوں نے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں اپنی زندگی صرف کردی اور یہ بھی سچ ہے کہ ہر عظیم شاعر و ادیب کو اپنے زمانے میں ناقدری کی شکایت رہی اور اس گلہ جوئی سے کوئی نہیں چھوٹا۔ بیشک فنکار کی پزیرائی اس کی اپنی زندگی میں اتنی نہیں ہو پاتی، جتنی وہ امید رکھتا ہے اور نا چیز آپ کی اس بات سے متفق ہے کہ شاعر و ادیب کو کسی شہرت یا ستائش یا صلے کی تمنا دل میں لئے بغیر اپنا کام کئے جانا چاہئے۔ بقول آپ کے، آج کے شاعر و ادیب کسی پاس و ادب کے احترام کے بغیر اپنی اپنی کھینچی ہوئی لکیروں پر دوڑ رہے ہیں۔ نتیجتاً وہ وہیں آکر رک جاتے ہیں جہاں سے دوڑ شروع ہوتی ہے۔ نہ ان کے ادب میں کوئی وسعت ہوتی ہے نہ ان کی تخلیقات میں گہرائی و گیرائی۔ آج کا شاعر خود کو کتنا ہی ترقی پسند اور جدت پسند گردان لے، بقول آپ کے، آج کا شاعر میرؔ و غالبؔ اور اقبالؔ کی دنیا سے باہر جھانکنا پسند نہیں کرتا۔ آج ہم ایک ایسے عجیب و غریب ادبی اور فنی دور سے گزر رہے ہیں جہاں شاعر و ادیب مختلف رسائل میں اپنے گوشے چھپا کر اپنا مقام عالمی ادب کے افق پر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جب ہم ان کی تخلیقات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد نتائج کا استنباط کرتے ہیں تو ان کے سوچوں کی پرواز کم اور سستی شہرتوں کی بھڑ بھڑاہٹ زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ حضرت مشتاق صاحب! میری یہ تحریریں آپ کے اداریے کا عکس ہیں، آپ نے اتنی کم مدت میں اتنا گہرا اور بڑا مشاہدہ کیا ہے، جو مشاہدہ نا چیز کو ساٹھ کتابیں ادب کو دینے کے بعد بھی نصیب نہیں ہو سکا۔ یقیناً آپ کا یہ اداریہ موجودہ دور کے شعرا و ادبا کے لئے ایک بصیرت انگریز تازیانہ ہے۔ اب اجازت چاہوں گا۔ غزلوں کی اشاعت کا شکریہ! امید ہے آپ بہمہ وجوہ اچھے ہوں گے۔

علیم صبا نویدی، چنئی

☆ آپ کی ادارت میں نہ صرف ''زبان وادب'' کی صورت و معنوی تصویر بدلی ہے بلکہ دیگر شعبے میں بھی آپ کے منصوبے نئے ڈھب سے سامنے آرہے ہیں۔ خدا آپ کو کامیاب کرے اور اردو کی ترقی کے لئے اٹھائے گئے ہر قدم کو قبول فرمائے۔

مہدیؔ پرتاپگڈھی، یوپی

☆ ''زبان وادب'' شمارہ اپریل ۲۰۱۶ء دستیاب ہوا۔ اداریہ پڑھ کر لگا کہ آپ نے اردو کے مخلص قلم کاروں کے دل کی باتیں تحریر فرمائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نئی نسل کو صبر کا مظاہرہ کرنا ہے، ورنہ نقصان بھی انہیں کا ہو سکتا ہے۔ اس بار افسانوی باب میں جناب شفیع مشہدی اور اختر آزاد کا جواب نہیں۔ ویسے میں شروع ہی سے محترمہ ذکیہ مشہدی اور جناب شفیع مشہدی کی قلمی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ اللہ ان کا سایہ تادیر سلامت رکھے تاکہ وہ اسی طرح فکشن کے باب میں اضافے کرتے رہیں۔ ''اردو کانفرنس'' کی روئیداد پڑھ کر، شرکت کی خواہش نے سر ابھار کر سرگوشی کی کہ کاش! مہاراشٹر کے احباب بھی اس ضمن میں غور فرمائیں تو اردو کا کچھ ماحول میسر آئے۔ مضامین کا حصہ بھی لائق مطالعہ ہے اور ''بچوں کا زبان وادب'' ہمیشہ کی طرح خوب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکادمی میں آپ کے آنے کے بعد تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان خوشگوار تبدیلیوں پر یقینی طور پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ کرے ذوق جنوں اور زیادہ

معین الدین عثمانی، جل گاؤں

☆ ''زبان وادب'' کے مئی ماہ کا شمارہ نہایت خوبصورت لائن دار سلور رنگ کے سرورق کے ساتھ منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس میں ہر چند تمام شمولات معیاری ہیں، تاہم یہ خاکسار بالخصوص افسانوں کی بابت ہی اپنے خیال رقم کر رہا ہے۔ ایم مبین صاحب کے زیر عنوان افسانے ''لذت'' میں کھلی ہوا میں سورج کی گرمی و پسینے کی بو، کے

PDF Compressor Free Version

ماحول میں بھولا ٹھیلے والے کے ہاتھوں سے بنائی گئی پاؤ بھاجی کے کھانے سے ملنے والی 'لذت' کو نایاب قرار دیا گیا ہے، اس کی بہ نسبت پرکاش بابو کی محل نما حویلی میں جا کر بنوائی گئی پاؤ بھاجی کو کئی گنا کمتر کہا گیا ہے۔ افسانے میں انسانی نفسیات کا عمیق و دقیق مطالعہ لائق ستائش گردانا جائے گا۔ صفحہ ۲۹ پر دوئم کالم میں ''پاؤ بھاجی'' لفظ سے قبل ''تمہارے'' کی بجائے ''کی'' لفظ ''تمہاری'' اور اسی لفظ ''پاؤ بھاجی'' کے اعادہ ہونے پر دوسری بار ''کے'' کی جگہ ''کی'' لفظ چاہیے تھا۔ جناب محمد ہاشم خان کے افسانے ''سروجنی'' میں صفحہ ۳۲ پر ''لہلانے'' کی جگہ ''لہلہانے'' لفظ کا تصرف درکار تھا۔ اگلے ہی صفحہ ۳۳ پر بھی ''جل کمیوں'' کی بجائے ''جل کنبھیوں '' لفظ درکار تھا۔ اس افسانے کے تحت ہیروئن سروجنی کے اپنے محبوب اشرف کے ساتھ محبت در ومانیت کی سیر حاصل بارش کی بجائے بعض اوقات فقط چھینٹوں سے ہی قارئین کے دل و دماغ کو سیراب و سرشار کرنا مقصود نہ تھا، جو کہ فقط یہی ایک فنی نقطہ افسانے کے کل جمع اثر کا انحطاط کرنے والا ہے۔ ویسے اس میں گاہے گاہے چند مکالمے ضرور دلدوز ثابت ہوتے ہیں۔ جرمنی سے ہما فلک کے افسانے ''پانچواں موسم'' میں انسانی نفسیات کی بخوبی خط کشی کی گئی ہے جو کہ قابل دید و داد ہے، مگر فقط اسلوب کی سطح پر نقطۂ عروج کا فقدان اکھرتا ہے اور اختتام بھی اگرچہ جدید انگریزی افسانوں و ناولوں کی ہی مانند ''اوپن اینڈ'' (Open End) کی ہیئت میں ترتیب دیا گیا ہے، تاہم یہ ذہن کو تشفی بخشنے میں ناکام ہی رہا ہے۔ اس کی ہیروئن علینہ کی نفسیاتی کشمکش ہندی کے نفسیاتی ادب کے لیے مشہور جینیندر کمار جی کی کہانی ''ماسٹر جی'' کی اہلیہ سے مشابہت رکھتی ہے، جو کہ کہانی میں اول تا آخر اپنے شوہر ماسٹر صاحب کی حد درجے کی اچھائی و ایمانداری وغیرہ انسانی قدروں سے بیزار و ناچار ہوتی ہے۔ ہما فلک صاحبہ کے افسانے میں عنوان ''پانچواں موسم'' اس کی غیر معمولی فطرت کا بھی غماز ٹھہرتا ہے۔ ہندی کی ہی افسانہ نگارہ مردلا گرگ نے اپنی کہانی ''ہری بندی'' میں ایک روز اول بار ہرے رنگ کی بندی پیشانی پر لگا کر غیر معمولی حرکتیں کی تھیں مثلاً ایک اجنبی خوبصورت نوجوان لڑکے کو فلم دیکھنے کے لیے اپنے ساتھ لے کر جانا وغیرہ کے توسط سے نسوانی نفسیات کی مثال پیش کی تھی۔ ہما فلک کے اس افسانے کو اسی شمارے میں ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی کی شائع اول رباعی ''اجداد سے پایا جو وتیرہ میں نے'' (ص ۵۰) کے ہی مقصود مفہوم سے قابل تقابل ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس شمارے میں صفحہ ۱۹ پر فیض احمد فیضؔ کے محولہ ایک مشہور و معروف شعر ''اور بھی ...... ہیں زمانے میں'' کے مصرعے میں سنسکرت ہندی کے لفظ ''دکھ'' کا دو بار استعمال متنازع فیہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس کی جگہ ''غم'' لفظ کا تصرف صحیح نہ تھا؟

کرشن بھاوک، پٹیالہ، پنجاب

☆ مکرمی! میں اپنے طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے آنے کے بعد ''بہار اردو اکادمی کا دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے، بلکہ ہوتا جا رہا ہے۔ بہار کے ادبا اور شعرا کے علاوہ دیگر ریاستوں کے ادبا و شعرا جو اردو زبان و ادب کی بقا کے لئے خون جگر سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں انہیں نوازتے رہنے کے سلسلے میں آپ نے اور آپ کے رفقا نے جو مستحسن اقدام کئے ہیں، اس کے لئے آپ سب لائق ستائش و مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یوں تو ملک کے ہر صوبہ میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا ہے، لیکن جو کارہائے نمایاں بہار اردو اکادمی انجام دے رہی ہے وہ اپنی جگہ منفرد ہے۔ اس کارہائے نمایاں کے سلسلے میں آپ اپنے رفقا کے ہمراہ ۳ر جنوری ۲۰۱۶ء کو بتیا تشریف لائے اور مجھے منجانب بہار اردو اکادمی اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ میں اپنی خوشی کا اظہار کیسے کروں، ہاں، اتنا تو ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس دن مجھے احساس ہوا کہ اردو زبان و ادب کے سلسلے میں مسلسل پینسٹھ برسوں سے میں جو کچھ کرتا چلا آیا ہوں، اس کا یہ صلہ ہے اور پھر میرے افسانوی مجموعہ ''اک دن کا لمبا سفر'' کو دوسرے انعام کا مستحق قرار دے کر اکادمی نے میری خوشیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس سلسلے میں آپ کا اور بہار اردو اکادمی سے وابستہ معززین کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ مجھے کسی قابل تصور کیا گیا۔ اس میں قطعی دو رائے نہیں کہ آپ کی آمد نے ماہانہ ''زبان و ادب'' کے حسن و معیار میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ میں طویل عرصہ سے آپ کو جانتا اور پہچانتا ہوں اور آپ کی ادبی صلاحیتوں سے بخوبی

PDF Compressor Free Version

واقف ہوں۔ آپ کے اندر کچھ کرنے اور کر گزرنے کا حوصلہ بہت ہے۔

شاکر کریمی، بتیا

☆ اپریل ۲۰۱۶ء کا شمارہ ''زبان وادب'' اس امر کا شاہد ہے کہ پھول اور کانٹوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ سرورق بہت اچھا ہے، تصویر کے آرٹسٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جناب شفیع مشہدی کو بھی ''پنڈدان'' افسانے کے لئے دلی مبارکباد! میری رائے میں جب یکجہتی پر ادب یکجا کیا جائے تو ''پنڈدان'' جیسے شاہکار افسانے کو ضرور شامل کیا جائے۔ محترمہ فرحت بانو نے سرسید احمد خاں کے حوالے سے جو مضمون تحریر کیا ہے وہ اچھی کوشش ہے۔ چونکہ وہ ریسرچ اسکالر ہیں، اس لئے انہوں نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے، مگر ہندو اور مسلمانوں کی ملی جلی زبان یعنی بول چال نے اردو زبان کو جنم دیا، یہ بات میں نے اس سے قبل کہیں نہیں پڑھی۔ جناب جمال اویسی کی پانچ نظمیں اور علی عباس امید کی ایک نظم، دونوں ہی اگرچہ ایک کیڈر کی ہیں، لیکن جناب امید کی نظم ''لمحوں کا حاصل'' بہت پسند آئی۔ جناب سہیل اختر کی دو غزلیں ایک ہی صفحہ پر شائع کی گئی ہیں جو بہت خوب ہیں۔ عموماً ایک یا دو ہی اشعار ایک غزل میں نکلتے ہیں، لیکن موصوف کی پہلی غزل ''بزم تنہائیوں کے ڈر سے ہے'' کے سبھی شعر چنیدہ و عمدہ ہیں۔ بقیہ غزلیں بھی اپنی جگہ معیاری اور اچھی ہیں۔ بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ دوروزہ اردو کانفرنس کے انعقاد کے لئے تمام معاونین کو تہہ دل سے مبارکباد!

طارق علی انصاری، سیتاپور

☆ ''زبان وادب'' مئی ۲۰۱۶ء کا شمارہ سامنے ہے۔ کور پیج پر نظر نہیں ٹھہر رہی ہے مشمولات کے بارے میں الگ سے خط لکھ رہا ہوں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب سے آپ کا بھی ایک خاص رشتہ تھا۔ آپ نے اداریہ میں ذکر کیا ہے۔ ''زبان وادب'' کا ایک خصوصی نمبر نکلنا چاہئے، ہم سب کا قلمی تعاون رہے گا، انشاء اللہ۔ شکیل الرحمٰن صاحب کے جنازے میں ہم بائیس لوگ تھے۔ خواجہ بھائی (پروفیسر خواجہ اکرام الدین) اور قومی کانسل والے۔ میرے دوست ڈاکٹر حنان خاں نے ادھ چینی میں میت کو غسل دیا۔ منظر عبرت انگیز تھا، آپ کو تفصیل بتاؤں گا، ہم اردو والوں کی بے حسی کا کیا عالم ہے۔ آپ بہت اچھا کر رہے ہیں۔ ہر جانب پزیرائی ہو رہی ہے۔ اللہ آپ سے ایسے ہی بڑے کام کراتا رہے۔ آمین

شفیع ایوب، نئی دہلی

☆ ماہ مئی کا شمارہ حسب معمول بذریعہ ڈاک تاخیر سے موصول ہوا۔ چھ دہائیاں پار کرنے کے باوجود آپ کی انتظامی و ادبی dynamism قابل ستائش کے ساتھ ساتھ ہم جیسے نئی نسل کے قلم کاروں کے لئے ''ذریعہ ترغیب'' بھی ہے۔ اس بار بھی شمارے کی محتویات وقیع ہیں۔ مقالات کے زمرے میں خصوصاً عشرت ظفر کی تحریر پسند آئی۔ میں ان کے اس نظریے سے متفق ہوں کہ عالم خورشید کی شعری کائنات ''جدیدیت'' کے دور سے گزرنے کے باوجود اس کے رجحانی حصار میں قید ہو کر نہیں رہ گئی، اس نے گزشتہ تمام اسلوبیاتی روشوں سے عطر کشید کر کے خود کو معطر کیا ہے۔ سنجیدہ غزل گوئی کے حوالے سے عالم خورشید آج یقیناً بہار کے نمائندہ شاعر ہیں، لیکن پانچ پانچ شعری مجموعوں کے خالق ہونے کے باوجود ادبی حلقے میں ان کی وہ قدر افزائی نہیں ہو سکی جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فصیح الدین احمد کا فیض کی شاعری کے مزاحمتی رجحان پر مبنی مقالہ پسند آیا۔ ان کا مقالہ اپنے محور کے آس پاس ہی سانس لیتا ہے جس سے مقالہ نگار کے انتقادیاتی بلوغ کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی ادعائیت کے جواز میں انہوں نے فیض کے جو شعری حوالے پیش کئے ہیں، وہ بھی انتہائی موزوں ہیں۔ ''زبان وادب'' کے مشتملات کے حوالے سے دیگر اضافوں کے ساتھ آپ نے ایک قابل قدر اضافہ یہ کیا ہے کہ زندہ تخلیق کاروں، مثلاً پہلے علیم اللہ حالی اور اس شمارے میں عالم خورشید کو جگہ دے کر اردو تنقید کی اس مردہ پرستانہ روش پر قدغن کی کوشش کی ہے جس کا نظریاتی طور پر میں بھی مخالف رہا ہوں۔ ایک کمی جو میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں، وہ اس رسالے میں لسانیاتی مقالے کی عدم اشاعت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ لسانیات جیسے اہم، مگر خشک موضوع پر لکھنے والے خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ اگر اس موضوع پر عرق ریزی کرنے والوں کے مضامین نہیں شائع ہوں گے تو آپ

PDF Compressor Free Version

تصور کر سکتے ہیں کہ اس صنف ادب کا مستقبل کیا ہوگا، لہٰذا گزارش ہے کہ لسانیاتی مضامین بھی ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں۔ *

زبیر احمد بھاگلپور، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ

* اگر ایسا مضمون دستیاب ہوگا تو ضرور شائع ہوگا۔ (ادارہ)

☆ ''زبان وادب'' مئی ۲۰۱۶ء ملا۔ حسب دستور ''سلام و پیام'' پڑھا۔ ایسے خاردار اور دلخراش خطوط شاید پہلے کبھی نہیں شائع ہوئے ہوں گے۔ ''اداریہ'' بھی چشم کشا ہے۔ بچوں کی اولین درس گاہ گھر ہوتا ہے۔ ہمارے عہد میں اردو، عربی کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہی ہوتا تھا۔ غضنفر بھائی نے بھی ''اردو کی عصری صورت حال'' میں دوٹوک گفتگو کی ہے۔ ''.....محفلوں میں مجلسوں میں اردو میں اظہار خیال کے بجائے انگریزی میں بولنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔'' میں یہاں یہ بھی اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اردو میں اپنے افکار کے اظہار پر قادر نہ ہونے کی صورت میں منہ میں پان رکھ لیتے ہیں، لیکن اردو جیسی کام دھینو گائے کے تھن سے آخری قطرہ تک نچوڑنے سے گریز نہیں کرتے۔ عشرت ظفر کا مضمون اچھا ہے۔ اعجاز علی ارشد بھائی کا انشائیہ بچوں ہی کے مابین گردش کرتا دکھتا ہے۔ افسانے آپ نے منتخب کیے ہیں، لہٰذا خراب ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ قطعات تاریخ وفات (پروفیسر عبدالمنان طرزی) پسند آئے۔ میں فن جمل کا ایک ادنیٰ طالب علم اپنی معلومات میں اضافہ کی غرض سے یہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ میری سمجھ سے مندرج ذیل مصرعوں سے مطلوب مادۂ تاریخ کا استخراج نہیں ہوتا ہے مثلاً:

(۱) بہ حکم الٰہی ہیں فردوس میں: 631 کے بجائے 636

(۲) ملک زادہ منظور احمد بھی واہ (1385) دونوں مصرعوں کے برآمد اعداد 2016 کے بجائے 2021 برآمد ہوتے ہیں

(۳) کہانی کار بھی اب ہائے انتظار حسین 2016 کے بجائے 2023

(۴) لو کہانی کار دنیا سے اب اک اٹھ گیا 643 کے بجائے 644

(۵) آبروئے فن افسانہ شری جوگیندر پال 1373 کے بجائے 1382

لہٰذا مطلوب مادہ 2016 کے بجائے 2026 برآمد ہوتا ہے۔

نیز قطعات تاریخ وفات میں تدغلہ سے بھی کام لیا گیا ہے، لیکن از روئے فن جمل قطعات کے ہر تیسرے مصرعے میں تدغلہ کا کوئی واضح اشارہ نہیں کیا گیا ہے مثال بطور سند ۔

تاریخ اُو بتدغلہ گوید سروش غیب

''خیرالنسا'' حضور ''شہ انبیا'' رسید

369 + 952 = 1321ھ

مجھے اپنی کم علمی کا شدت سے احساس ہے۔

منیر سیفی، سمن پورہ، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' (مئی ۲۰۱۶ء) مقابل نظر ہے۔ سرورق اور مختلف مواقع کے تعلق سے دیدہ زیب تصاویر نے رسالے کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیا ہے۔ اس بار کے ''حرف آغاز'' کی زبان ایک مدیر کی نہیں بلکہ انسان دوست کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ شکیل الرحمٰن صاحب کے حوالے سے آپ کی گفتگو نے آنکھوں کو آبدیدہ کر دیا۔ شذرے کے مشمولات بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوس صدیقی صاحب کی حمد نے خصوصیت سے متاثر کیا۔ مجھے بہن روشن آرا کا چیلنج مؤدبانہ قبول ہے۔

شکیل سہسرامی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' (ج ۳۷ ش ۵) اپنی روایتی رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ حالیہ اکادمی پروگرام کی رپورٹ اور تصویریں یہ بتا رہی ہیں کہ اکادمی کی علمی وثقافتی فعالیت اپنے شباب پر ہے، خدائے پاک اسے نظر بد سے بچائے۔ آپ نے اداریے میں بہت بنیادی اور اصولی بات لکھی ہے کہ ''ہم اپنے منفی رویے سے کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں نکال سکتے۔ آدھے بھرے ہوئے گلاس کو آدھا خالی کہنے کی ضد سے ہمیں پرہیز کرنا ہوگا تب ہی ہم کامیابی کی دہلیز پار کر سکیں گے۔'' کاش اردو کی باتیں کرنے والوں کے لئے یہ جملہ ان کی ذہن سازی کا موجب بن جائے۔ ''اردو کی عصری صورت حال'' پر جناب غضنفر نے بہت اچھا تجزیہ پیش کیا ہے اور جناب عشرت ظفر کے قلم سے ''عالم خورشید کی نئی غزلیں'' بھی اپنی جہات نو کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ ایم۔ مبین کا افسانہ ''لذت'' اور ہما فلک کا ''پانچواں موسم'' بہت پسند آیا۔ یہ دونوں کامیاب نفسیاتی کہانیاں ہیں اور یہی وصف محمد ہاشم

PDF Compressor Free Version

خاں کی ''سروجنی'' میں بھی پایا جاتا ہے۔ ''انشائیہ'' کے تحت پروفیسر اعجاز علی ارشد کی تحریر بھی نہایت کامیاب ہے اور حسب موضوع سماج کو آئینہ دکھاتی ہے۔ اس شمارے کا شعری حصہ بھی خوب ہے۔ قوس صدیقی کا حمدیہ ونعتیہ کلام اور سلیم شہزاد کی نظم ''سات جنموں کی ادھوری کتھا نظم ہے'' نے بیحد متاثر کیا۔ اس شمارے میں رباعی نگار شعرا کی بہت ہی عمدہ سوغات آپ نے یکجا کردی ہے، اس کے لئے خصوصی شکریہ!

''کتابوں کی دنیا'' کے بام ودر بھی اپنے اپنے انداز میں خوب متوجہ کر رہے ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی کامیاب ہے۔ ڈاکٹر شائستہ انجم نوری نے اگر ''کبوتر'' کے بارے میں دلچسپ حقائق سے نوازا ہے تو بچوں کی ذہن سازی کے لئے صدف جہاں کی تحریر ''رازق العباد'' بھی بہت عمدہ ہے۔

احتشام احمد قادری، مظفر پور

☆ ''زبان وادب'' میرے ہاتھوں میں ہے نہ صرف آپ نے اس کے معیار پر توجہ فرمائی بلکہ اس کے سرورق پر بھی کافی محنت کی ہے۔ اداریہ میں آپ نے جو کچھ بھی کہا یوں لگا کہ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہو میں نے بھی اسی بات پہ زور دیا تھا کہ ہمیں اپنی ذاتی کوشش میں مزید اضافہ کرنا چاہئے۔ یہ بالکل صحیح بات ہے کہ اگر اردو کے ہر شیدائی کے ساتھ ساتھ سرکار بھی اسکولوں میں اردو کی تعلیم بحال کرے اور وقت پر کتابیں دستیاب ہوں تو اردو کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہے گا۔ آپ جس جانفشانی، محنت اور لگن سے رسالہ نکالتے ہیں۔ میں اس کی دل سے معترف ہوں۔ میری نظر میں حق گوئی کے ساتھ جائز تعریف بھی ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ رسالہ ملک میں ہی نہیں بیرون ملک میں بھی سفر کر رہا ہے، مگر مثل مشہور ہے کہ چراغ تلے اندھیرا، وہی یہاں بھی صادق آتا ہے۔ سبزی باغ ''بک امپوریم'' کو چھوڑ دیں تو ''زبان وادب'' کا کہیں اور ملنا محال ہے خود سلطان گنج میں یہ دستیاب نہیں۔ اس میں قصور دوکان داروں کا نہیں بلکہ اردو کے قاری کا ہے۔ لوگ اگر اس چیز کے خریدار نہیں ہیں تو وہ چیز کیوں کر دستیاب ہوگی۔ خورشید عالم کی غزلوں کا ایک جائزہ پسند آیا۔ حقیقت پر مبنی جائزہ ''اردو کی عصری صورت حال'' کے لئے میں غضنفر صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں، ابھی اردو کے لئے کسی تحریک کی اشد ضرورت ہے اور جو لوگ بھی اس میں شامل ہوں گے انہیں اس کا اجر ضرور ملے گا۔ آمین! تمام مضامین، افسانے اور منظومات پسند آئے۔

شبانہ عشرت، پٹنہ

قلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔ اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تاکہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کردی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔ اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی قلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کردیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زرسالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زرسالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

بچوں کا
زبان وادب

☆	حضرت علی کی معاملہ فہمی	ڈاکٹر ابو منور گیلانی	۷۴
☆	قرآن اور سائنس	عبدالودود انصاری	۷۵
☆	کتاب میلے کا افادی پہلو	شرف الہدیٰ	۷۶
☆	گرمی	ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی	۷۷
☆	ماہِ صیام	سردار پنچھی	۷۸
☆	آم	شجاع الدین شاہد بنی	۷۸
☆	کرکٹ	ڈاکٹر شارقہ شفیق	۷۹

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر ابو منور گیلانی

Retd. (Univ. Prof.) & Head Deptt. of Urdu, B.R.Bihar Univ. Muzaffarpur

حضرت علی کی معاملہ فہمی

خلیفہ چہارم امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی معاملہ فہمی سوجھ بوجھ اور راست گوئی کے متعلق بہت سارے واقعات مشہور ہیں۔ انہیں میں سے ایک واقعہ یہاں نقل کر رہا ہوں جس سے بچوں کی ذہنی نشو ونما میں مدد مل سکتی ہے۔

واقعہ اس طرح مذکورہ ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی کھانا کھانے بیٹھے۔ ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس تین۔ اتنے میں ایک آدمی اور آ گیا۔ ان دونوں نے اسے اپنے ساتھ کھانے پر بٹھالیا، جب وہ تیسرا آدمی کھانا کھا کر چلنے لگا تو اس نے آٹھ درہم ان دونوں کو دے کر کہا کہ:

''جو کچھ میں نے کھایا ہے اس کے عوض میں سمجھو۔''

اس کے جانے کے بعد ان دونوں میں درہموں کی تقسیم کے متعلق جھگڑا ہونے لگا۔ پانچ روٹیوں والے نے دوسرے سے کہا کہ:

''میں پانچ درہم لوں گا اور تجھ کو تین ملیں گے کیونکہ تیری روٹیاں تین تھیں۔'' تین روٹیوں والے نے کہا:

''میں تو نصف سے کم پر ہرگز راضی نہ ہوں گا یعنی چار درہم لے کر چھوڑوں گا۔''

اس جھگڑے نے یہاں تک طول کھینچا کہ وہ دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان دونوں کا بیان سن کر تین روٹیوں والے سے کہا کہ ''تیری روٹیاں کم تھیں۔ تین درہم تجھ کو زیادہ مل رہے ہیں، بہتر ہے تو رضامند ہو جا۔''

اس نے کہا: ''جب تک میری حق رسی نہ ہوگی میں کیسے راضی ہو سکتا ہوں۔''

حضرت علیؓ نے فرمایا: ''پھر تیرے حصہ میں صرف ایک درہم آئے گا اور تیسرے ساتھی کے حصے میں سات درہم آئیں گے۔''

یہ سن کر اس کو بہت ہی تعجب ہوا کہنے لگا: ''آپ بھی عجیب قسم کا انصاف کر رہے ہیں۔ ذرا مجھ کو سمجھا دیجئے کہ میرے حصہ میں ایک اور اس کے حصہ میں سات کس طرح آتے ہیں۔'' حضرت علیؓ نے فرمایا:

''سنو! کل آٹھ روٹیاں تھیں اور تم تین آدمی تھے چونکہ یہ مساوی طور پر تقسیم نہیں ہو سکتیں لہٰذا ہر ایک روٹی کے تین ٹکڑے قرار دے کر کل چوبیس ٹکڑے سمجھو۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس نے کم کھایا اور کس نے زیادہ، لہٰذا یہی فرض کرنا پڑے گا کہ تینوں نے برابر کھانا کھایا اور ہر ایک شخص نے آٹھ آٹھ ٹکڑے کھائے۔ تیری تین روٹیوں کے نو ٹکڑوں میں سے ایک اس تیسرے شخص نے کھایا اور آٹھ تیرے حصہ میں آئے اور تیسرے ساتھی کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑوں میں سے سات اس تیسرے شخص نے کھائے اور آٹھ تیرے ساتھی کے حصہ میں آئے۔ چونکہ تیرا ایک ٹکڑا اور تیرے ساتھ کے سات ٹکڑے کھا کر اس نے آٹھ درہم دیئے ہیں، لہٰذا ایک درہم تیرا ہے اور سات درہم تیرے ساتھی کے۔'' یہ سن کر اس نے کہا: ''ہاں! اب میں راضی ہوتا ہوں۔''

(تاریخ اسلام، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی سے خصوصی استفادہ)

❁❁❁

☆ زندگی ایک ہیرا ہے، جسے تراشنا انسان کا کام ہے

☆ انسان وہی ہے، جسے شرم وحیا کا احساس ہو

☆ عقلمند صبر کرتا ہے، لیکن بیوقوف انتقام پر آمادہ ہو جاتا ہے

☆ اپنا وہی ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے

☆ بے صبری صبر سے زیادہ تکلیف دہ ہے

PDF Compressor Free Version

عبدالودود انصاری
Shadaab Manzil, B.L.No.6, H.No. 43/2
P.o. Kankinara 743126 (W.B.) (Mob. 9433354562)

قرآن اور سائنس

پیارے بچو! ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب اسلام ہے، ہماری مذہبی کتاب قرآن ہے۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ یہ سراسر ہدایت والی کتاب ہے، ہدایت کے معنی سیدھا اور کامیابی کا راستہ ہے۔ ہدایت جسے مل گئی وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب اور بامراد ہوگیا۔

پیار بچو! آج سائنس کا بول بالا ہے۔ ہر چہار جانب سائنس کی ترقیاں نظر آرہی ہیں۔ سائنس کے ذریعہ ہی انسان ہوا میں اُڑ رہا ہے، چاند کی دھرتی پر قدم جمارہا ہے، سمندر کی تہہ سے ہیرے اور موتی حاصل کررہا ہے۔ سائنس کی بدولت ہی انسان نے اپنی زندگی کو آرام اور آسائش سے مزین کررکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج سائنس کی بدولت دنیا مٹھی میں آگئی ہے۔ اب سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ کیا مذہب اسلام سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ تو آپ جان لیجئے اس کا صحیح جواب ''ہاں'' ہے یعنی اسلام سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کی صدفی صد اجازت دیتا ہے۔ دیکھئے ہم سب کو معلوم ہے کہ روئے زمین پر اللہ نے سب سے پہلے حضرت آدم کو پیدا کیا۔ جس وقت حضرت آدم زمین پر پیدا ہوئے اس وقت سے ہی زمین پر تمام قدرتی چیزیں مثلاً درخت، پودے، جنگل، پہاڑ، دریا، نالے وغیرہ موجود تھے، لیکن آدم کو زمین پر موجود چیزوں کے بارے میں قطعی علم نہ تھا اور نہ ہی ان کی خاصیت یعنی ان کے خواص کا انہیں علم تھا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مبین، سورہ البقرہ کی آیت ۳۱ میں فرماتا ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

(اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان تمام چیزوں کے نام کا)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام اشیا کے ناموں کا علم سکھایا۔ بزرگانِ دین اور اللہ والے فرماتے ہیں کہ ''اسما'' سے مراد ''مسمیات'' ہے جس کے معنی اشیا کے خواص ہیں۔ یعنی اللہ نے آدم کو دنیا میں موجود تمام چیزوں کے خواص یعنی خاصیت کو بتایا۔

پیارے بچو! اب ذرا سائنس کی تعریف پر ایک نظر ڈالی جائے۔ آخر سائنس ہے کیا؟ آپ اچھی طرح جان لیں کہ عام فہم زبان میں روئے زمین پر پائے جانے والی قدرتی اشیا کی خاصیت کا جاننا اور قدرتی واقعات کی وجوہات کا پتا لگانا ہی سائنس ہے۔ مثلاً پانی کو فی جاننا اور پہچاننا یہ پانی کے علم کی بات ہوئی مگر اس کے خواص مثلاً پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے، یہ اپنی سطح خود تلاش کرلیتا ہے۔ یہ اونچی سطح سے نیچی سطح کی جانب بہتا ہے، یہ رقیق، ٹھوس اور گیس تینوں شکلوں میں پایا جاتا ہے، یہ آگ بجھاتا ہے، اس سے گندگی صاف ہوتی ہے، اس سے جاندار کی پیاس بجھتی ہے، یہ سب پانی کے اوصاف ہیں اور ان ہی اوصاف کا جاننا ''سائنس'' ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ شے کے خواص یعنی سائنس کو حضرت آدم کو سکھایا تو ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بھی اللہ اور اس کے رسول کے حکموں پر چل کر سائنس کی تعلیم حاصل کریں تاکہ سائنس میں ایجادات اور انکشافات کرکے پوری دنیا کے انسانوں کو فائدہ پہنچاسکیں۔

☆ عادت پر غلبہ پانا کمال فضیلت ہے
☆ مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے
☆ خوش وہ انسان پاسکتا ہے جو اپنی خواہشات کو قابو میں رکھے
☆ زندگی ایک پھول ہے اور محبت اس کی خوشبو
☆ بیوقوف کو اپنی تعریف اور ستائش کے لئے ہمیشہ اپنے سے بڑے بیوقوف کی تلاش ہوتی ہے

PDF Compressor Free Version

شرف الہدیٰ

Sub Editor "Sangam" Urdu Daily, Sultanganj, Patna (Mob.9006909912)

کتاب میلے کا افادی پہلو

بچو! میلہ اور تفریح گاہ بھی ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی ان سے ہماری زندگی اور روزمرہ کے معمولات میں بدلاؤ آجاتا ہے اور طبیعت کو فرحت مل جاتی ہے۔ آدمی کی فطرت ہے کہ وہ یکسانیت سے گھبرا جاتا ہے اور اپنے معمول زندگی میں کچھ فرق چاہتا ہے اور اس کی یہ چاہت، تہوار، میلے ٹھیلے اور تفریح گاہوں سے پوری ہوتی ہے۔ یوں تو میلے کی مختلف نوعیت ہوتی ہے، مثلاً کپڑوں کے میلے یا نمائشیں، دستکاری یا ہینڈی کرافٹ کے میلے اور ایگزیبیشن کا انعقاد یا پھر روزگار میلے (Job Fair) وغیرہ۔ ان ہی میلوں میں ایک خاص میلہ کا نام کتاب میلہ (Book Fair) بھی ہے، جہاں ایک طے شدہ مقام پر ملک کے مختلف ناشرین وکتب فروش اپنے اپنے بک اسٹال لگاتے ہیں اور شائقین اور شیدائی کتب کی توجہ خاص کا مرکز بنتے ہیں۔ یہ میلے ہر سال یا پھر کچھ مختصر مدت کے وقفے سے مختلف شہروں میں منعقد کئے جاتے ہیں۔

بہار کی راجدھانی پٹنہ کے گاندھی میدان میں گزشتہ سال ۲۴ نومبر کو نیشنل بک ٹرسٹ (NBT) کے کتاب میلے کا افتتاح کیا گیا تھا۔ اس میلے میں ہندوستان کے مختلف بک پبلشرز نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے اہل ذوق کی ضرورتیں پوری کیں، جہاں عصری، ادبی، سائنسی، طبی کتابوں کے علاوہ اسلامی کتابوں کے بھی اسٹال لگائے گئے تھے۔

پیارے بچو! دیکھا جائے تو کتاب ثقافت (Book Culture) سے ہماری ریاست بہار کا گہرا تعلق رہا ہے۔ ہماری ثقافتی زندگی کے ساتھ ساتھ کتابوں کی ثقافت بھی چلتی ہے۔ یہ ہماری شخصیت اور سماجی زندگی کے نمایاں پہلو ہیں۔ کتابیں انسان کی بہترین اور وفادار دوست ہیں، ان معاملہ سے عزلت وتنہائی کا احساس جاتا رہتا ہے اور ہماری غفلت اور ہماری تازہ معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کتاب میلے کے بہت سارے افادی پہلو ہیں مثلاً:

- ☆ نئی نئی کتابوں اور نئے ناشرین سے متعارف ہونا
- ☆ منتخب موضوعات پر کتابوں کا دستیاب ہوجانا
- ☆ کتابوں کے علاوہ رسائل وجرائد کی دستیابی
- ☆ مطالعہ کے شوق میں اضافہ اور معلومات میں اضافہ
- ☆ کلچرل وعلمی پروگرام میں شریک ہونے کا موقع فراہم ہونا
- ☆ مقامی سطح پر باآسانی کتابوں کی دستیابی اور مصنفین سے متعارف ہونے کا موقع
- ☆ علمی مباحثے، سمینار اور ڈرامے میں حصہ لینے کے مواقع
- ☆ ضرورت کے تحت فرہنگ ولغات کی دستیابی
- ☆ کئی ہم وطن لوگوں سے ملاقات کا موقع جو بغرض تجارت یا ملازمت دوسری جگہ رہتے ہوں۔
- ☆ مختلف کتب فروشوں اور ناشرین کی کتابوں کی فہرست (Catalogue) حاصل کر کے ان کتابوں تک رسائی۔

لہٰذا ہمیں چاہئے کہ کتابوں سے محبت کریں اور جب کتاب میلے کا انعقاد ہو تو اس میں شوق سے شرکت کریں۔ اس طرح تفریح بھی ہوگی اور آپ کو اپنی پسند کی کتابیں حاصل کرنے اور ان کے مطالعہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی ملتا رہے گا۔

- ☆ محبت کا ایک عمدہ پہلو یہ ہے کہ وہ فکر کرنے کی عادت ڈالتی ہے
- ☆ کسی کی محبت پر ہنسنا انسانیت کے منافی ہے
- ☆ جو شخص عزت کا خواہاں ہے اسے چاہئے کہ خدا کی اطاعت کرے
- ☆ سب سے قیمتی چیز عزت ہے اور سب سے مہنگی چیز دوستی

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی

339/Bari Hath, Bahraich 271801 (U.P.)

گرمی

موسم آیا ہے گرمی کا لطف اُٹھاؤ اب چھٹی کا
سورج پیہم آنکھ دکھاتا گھر سے نکلو لے کر چھاتا
جب بھی گھر سے باہر نکلو سر پر ٹوپی، گمچھا رکھ لو
ٹھنڈی ٹھنڈی چیزیں کھاؤ گرمی سے چھٹکارا پاؤ
لیچی، قلفی اور فالودہ من کو بھائے کھیرا، خربوزہ
میٹھے میٹھے، پیلے پیلے اچھے لگتے آم رسیلے
دادا جب بازار سے آتے آم کو جھولی میں بھر لاتے
لو کے جھونکوں سے تم بچنا پیڑوں کے سائے میں چلنا
بات ہماری مانو بچو کپڑے پیہم سوتی پہنو
سورج جب آتا ہے سر پر آنے لگتا ہے پھر چکر
کتنی شدت کی ہے گرمی پنکھا جلدی ہاکو ممی

اس گرمی میں جینا دوبھر
پاپا گھر میں لاؤ کولر

PDF Compressor Free Version

سردار پنچھی
Punjab Mata Nagar, Ludhiana 141013(Mob.9417091668)

ماہِ صیام

رحمت کی بارش ہوتی ہے ، آیا ہے مہینہ روزے کا
کیوں لگے گی غم کی دھوپ انہیں جن پر ہے سایہ روزے کا

یہ طوفان یہ موسم کیا ہے
گردابوں کا بھی غم کیا ہے

مالک نے ہم کو عطا کیا طوفاں میں سفینہ روزے کا
رحمت کی بارش ہوتی ہے ، آیا ہے مہینہ روزے کا

روحوں کی ہوتی ہے صفائی
نیکی کی ہوتی ہے کمائی

آقا کی طرف سے لوگوں نے پایا ہے یہ تحفہ روزے کا
رحمت کی بارش ہوتی ہے ، آیا ہے مہینہ روزے کا

اس کا چلن ہے ہر مذہب میں
اک مطلب ہے ہر مطلب میں

انسان کی ہستی کی خاطر اچھا ہے قرینہ روزے کا
رحمت کی بارش ہوتی ہے ، آیا ہے مہینہ روزے کا

اک نیکی سو پنیہ ہیں ملتے
اک مسکان سے پھول ہیں کھلتے

وہ قسمت والے ہیں جن کو مل جاتے خزینہ روزے کا
رحمت کی بارش ہوتی ہے ، آیا ہے مہینہ روزے کا

شجاع الدین شاہد منی
75/599, MHB. Colony No. 8, Malwani, Malad (W)
Mumbai 400095 (Mob9969039485)

آم

سارے پھلوں کا میں سردار
مجھ سے مہکے ہر بازار
مہنگا بھی ہوں ، سستا بھی
میٹھا بھی ہوں کھٹا بھی
ہر اک کے میں جاؤں قریب
پیسے والا ہو یا غریب
کوکن ہو یا ملیح آباد
مجھ سے کتنے گھر آباد
ماشاء اللہ خوب تھا میں
غالبؔ کو مرغوب تھا میں
آج بھی تو مقبول ہوں میں
اک مہکتا پھول ہوں میں
ہر اک پھل کی اپنی جگہ
لیکن میں ہوں سب سے جدا
بتلاؤ تو میرا نام
مجھ کو سب کہتے ہیں آم

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر شارقہ شفتین
سنت زیویر ہائی اسکول، گاندھی میدان، پٹنہ (Mob. 9386384594)

کرکٹ

''ممی دیکھئے ماموں آئے ہیں..... ماموں آئے ہیں۔ السلام علیکم.....'' احمر نے خوش ہوتے ہوئے اپنی ممی کو ماموں کے آنے کی اطلاع دی اور کہنے لگا:

''ماموں اب آپ چلئے، میرے ساتھ کرکٹ کھیلئے۔ میں کتنے دنوں سے آپ کا انتظار کر رہا تھا، مگر آپ ایک ہفتہ سے ہمارے گھر نہیں آئے۔ میں بہت اداس تھا..... میرے ساتھ چھوٹی بھی نہیں کھیلتی ہے، کیونکہ اسے کرکٹ کھیلنا نہیں آتا۔''

احمر کے ماموں نے احمر کو گود میں اٹھالیا اور پیار سے کہنے لگے: ''بیٹا ابھی تو میں آیا ہی ہوں تھوڑا آپ کی ممی سے مل لوں، چھوٹی گڑیا کو پیار کرلوں تب.....''

ماموں کی بات سن کر احمر اداس ہوگیا اور کہنے لگا:

''آپ سب گندے ہیں میرے ساتھ کوئی نہیں کھیلتا ہے۔ میرا دوست مزمل اپنی نانی ماں کے گھر ایک ہفتہ سے گیا ہوا ہے۔ میرے ساتھ کوئی کھیلنے والا نہیں ہے، اس لئے میں آپ کو کہہ رہا ہوں، ورنہ میرے گلی کے دوست کافی ہیں میرے ساتھ کھیلنے کے لئے۔''

احمر کے ماموں نے تعجب سے کہا:

''تو آپ گلی میں کھیلتے ہیں، یہ تو غلط بات ہے کسی کو چوٹ لگ گئی، کسی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو آپ کیا کریں گے، پھر وہ لوگ شکایت کرنے آپ کے گھر آئیں گے۔''

احمر کے ماموں ابھی احمر کو سمجھا ہی رہے تھے کہ مزمل آواز لگاتے ہوئے آجاتا ہے:

''احمر..... احمر..... میں آگیا چلو ہم لوگ کرکٹ کھیلتے ہیں۔''

احمر مزمل کی آواز سن کر خوش ہوجاتا ہے اور پھرتی سے بلہ اور گیند اٹھا کر دروازے کی طرف لپکتا ہے۔ احمر کے ماموں اسے روکنا چاہتے ہیں، لیکن احمر فوراً غائب ہوجاتا ہے۔

احمر کے ماموں سوچنے لگے کہ احمر بھی بالکل میری ہی طرح ہے۔ میں بھی بارہ تیرہ سال کی عمر میں صرف کرکٹ کھیلنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا، جب بھی وقت ملتا ہاتھ میں بلہ اور گیند رہتا تھا، لیکن ایک حادثے نے مجھ سے میرا یہ شوق چھین لیا۔ اس حادثہ کو یاد کرکے آج بھی میں ڈر جاتا ہوں، لیکن احمر کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آئے، اس لئے میں اسے سمجھاؤں گا اور اس کا داخلہ کرکٹ اکیڈمی میں کراؤں گا۔

احمر کے ماموں اپنی بہن کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے:

''آپی جب احمر کو کرکٹ کھیلنا اتنا پسند ہے تو پھر اس کا داخلہ کرکٹ اکیڈمی میں کیوں نہیں کرا دیتیں۔ آپ بولیں تو میں بات کروں۔ اس کا یہ شوق شاید اسی فیلڈ میں کامیابی دلادے۔''

احمر کی ممی بولتی ہیں: ''تم ٹھیک کہتے ہو اور میں تمہارے جذبات بھی سمجھ رہی ہوں۔''

قریب آدھے گھنٹے کے بعد احمر اپنے دوست مزمل کے ساتھ واپس آیا ہے اور آنے کے بعد پھر مزمل کے ساتھ گھر میں کرکٹ کھیلنے لگا، احمر کے ماموں ان کے پاس گئے اور پیار سے بلہ اور گیند ان کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے دونوں کو اپنے سامنے صوفے پر بیٹھا کر جیب سے چاکلیٹ نکالا اور انہیں دیتے ہوئے بولے:

''آج آپ کھیلنے نہیں جائیں گے۔ آج میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔''

دونوں کہانی کے نام سے خوش ہوگئے اور اپنی اپنی فرمائش کرنے لگے۔ احمر بولا:

PDF Compressor Free Version

''مجھے بھوت کی کہانی سننی ہے۔'' مزمل نے کہا:

''مجھے الین کی کہانی سننی ہے۔'' ماموں بولے:

''آج میں آپ کو ان سب سے الگ کہانی سناؤں گا۔''

احمر کہنے لگا: ''الگ کہانی؟ وہ کیا ماموں۔''

احمر اور مزمل تعجب سے ایک دوسرے کا چہرا دیکھنے لگے۔

''ہاں بالکل الگ..... سنو بہت سال پہلے کی بات ہے۔ تمہاری طرح تین دوست تھے کاشف، کامران اور شادان تینوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ تینوں ایک ہی بلڈنگ میں رہتے، ایک ہی اسکول میں پڑھنے جاتے اور شام کے وقت کبھی چھت پر کبھی گلی میں کرکٹ کھیلتے۔ ان کے گھر والے انہیں اس طرح کرکٹ کھیلنے سے اکثر منع کرتے اور میدان جانے کی ہدایت دیتے، لیکن میدان گھر سے تھوڑی دوری پر ہونے کی وجہ سے وہ جانے سے کتراتے اور گلی کے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ ابھی گرمی کی چھٹی شروع ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے یہ ارادہ کیا کہ اب روز صبح صبح اٹھ کر ہم لوگ کرکٹ کھیلیں گے، کیوں کہ صبح کے وقت روڈ پر رش کم رہتا ہے اور گاڑیاں بھی کم چلتی ہیں۔

اپنے پلان کے مطابق وہ لوگ روز صبح گلی کے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگے۔ ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ چھٹی کے آخری دن تک جو سب سے زیادہ رن بنائے گا اسے انعام ملے گا۔ آخر پورا مہینہ گزر گیا اور فائنل کا دن آگیا۔ اب تک جس نے زیادہ رن بنایا تھا ان میں شادان اور گلی کا ایک بچہ تھا۔ آخری دن ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے اندر جوش وخروش بہت زیادہ تھا۔ آخر رات گزری اور صبح ہوتے ہی سب اپنے اپنے گھر سے باہر آگئے۔ آخری میچ شروع ہو چکا تھا روپیہ اکٹھا کر کے ایک ٹرافی بھی لائی گئی تھی اور یہ ارادہ کیا گیا کہ یہ ٹرافی اسے دی جائے گی جو سب سے زیادہ رن بنائے گا، شادان نے پہلی گیند پر پہلا چھکا مارا دوسری گیند پر بھی اس نے چار رن لئے، ابھی وہ خوشی سے اچھل ہی رہا تھا کہ زوردار چیخ سنائی دی تمام بچے بلہ گیند چھوڑ کر سڑک پر گری ہوئی اس عورت کی طرف دوڑے جسے گیند سے زوردار چوٹ لگی تھی۔ نہیں معلوم وہ عورت اچانک کس طرف سے آگئی تھی۔

دو چار بڑے لوگ جو وہاں پر کھڑے تھے نزدیک آگئے اور بچوں کو ڈانٹنے لگے۔ اس عورت کا چہرہ خون سے لت پت تھا۔ شور وغل سن کر بلڈنگ سے بھی کئی لوگ باہر آگئے۔ ماں باپ کو دیکھ کر بچوں کی حالت بھی ڈر سے خراب تھی۔ سبھی اکٹھا کھڑے چپ چاپ تماشائی بنے بڑوں سے ڈانٹ سنتے رہے۔ بھیڑ میں سے ایک نے رکشہ بلایا اور اس روتی کراہتی عورت کو ہسپتال لے جایا گیا۔ خون بہہ رہا تھا، لیکن یہ نہیں سمجھ میں آرہا تھا کہ چوٹ کہاں لگی ہے شادان، کامران اور کاشف کے گھر کے لوگ بھی ہسپتال گئے۔ ان کے گھر آنے پر یہ خبر ملی کہ اس عورت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے ایک آنکھ سے معذور ہوگئی ہے۔

یہ خبر سنتے ہی ان تینوں کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ شادان کے ابو نے غصے میں شادان کا بلہ دو ٹکڑے کر دیا، دوسری طرف کامران اور کاشف کے گھر میں بھی یہی حال تھا۔ ان لوگوں نے اپنے بڑوں کی بات نہیں سنی، اس لئے ان کے باہر کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔

احمر کے ماموں نے احمر سے پوچھا: ''آپ لوگوں نے کہانی سن کر کیا فیصلہ کیا؟ باہر گلی میں کرکٹ کھیلیں گے جہاں لوگ آتے جاتے ہیں؟'' ماموں کی بات سن کر احمر اور مزمل دونوں ایک ساتھ ایک زبان ہو کر کہنے لگے نہیں اور دوسروں کو بھی کھیلنے نہیں دیں گے۔''

احمر کے ماموں بولے اور دوسری اہم بات یہ کہ ''احمر وہ 'شادان' کوئی اور نہیں میں آپ کا ماموں تھا۔ میں اس بات کو آج تک نہیں بھول پایا کہ ہماری غلطی کی وجہ سے عمر بھر کے لئے آنکھ جیسی عظیم عظمت سے وہ عورت محروم ہوگئی، اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کا میں کرکٹ اکیڈمی میں داخلہ کروا دوں گا۔'' احمر خوش ہو کر شادان ماموں زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔

ماموں بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے بولے۔ ''بچو! کرکٹ تمام لوگوں کا پسندیدہ کھیل ہوتا ہے۔ بچے اسے کافی پسند کرتے ہیں اور بچوں کو کھیلنا بھی چاہیے کیوں کہ اگر وہ نہیں کھیلیں گے تو مستقبل میں بہتر کھلاڑی کہاں سے آئیں گے، لیکن کوئی بھی کھیل کھیلتے وقت یہ دھیان ضرور رکھنا چاہیے کہ کسی کو آپ کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے جو عمر بھر کے لئے تکلیف کا باعث بنے۔